مواعظ حکیم الامتؒ اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ

الامداد

لاہور
پاکستان

مدیر مسئول
مشرف علی تھانوی

مدیر
خلیل احمد تھانوی

جلد ۱ | شوال ۱۴۲۰ھ / جنوری ۲۰۰۰ء | شمارہ ۲

(۴)

التہذیب

اصلاحِ نفس کا طریقہ

ازافادات: حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ ۱۰/= روپے ○ زرِ سالانہ ۱۰۰/= روپے

پتہ دفتر
ماہنامہ الامداد
جامعہ دار العلوم الاسلامیہ
۲۹۱ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور
فون نمبر
۵۴۲۲۲۱۳-۵۴۸۰۶۰

ناشر
مشرف علی تھانوی
مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
مقامِ اشاعت
جامعہ دار العلوم الاسلامیہ لاہور پاکستان

حضرت والاؒ نے یہ وعظ ۱۳ رمضان المبارک سنہ ۱۳۳۲ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر ۳ گھنٹے ۳۰ منٹ "اعتکاف کی حکمتیں اور فضیلتیں" کے موضوع پر عام لوگوں کو بیان فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۵۰۰ تھی۔ مولوی محمد عبداللہ گنگوہیؒ نے اسے قلم بند فرمایا

التہذیب نمبر: ۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ نحمدہ ونستعینہ و نستغفرہ و نومن بہ و نتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہ ورسولہ و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ و بارک وسلم۔

امابعد: فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم. وَاِذا عتزَلتُمُوهُم و ما یعبدون الا اللہ فاووا الی الکھف ینشرلکم ربکم من رحمتہ وھیئ لکم من امرکم مرفقا[1]

تمہید

میں نے اس سے پہلے تین جمعوں میں مبسوط[2] طور سے بیان کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بعض حکم و مصالح کے لیے اس ماہ مبارک میں روزہ اور قیام لیل[3] یہ دو عبادتیں مشروع فرمائی ہیں اور ان حکم و مصالح کو بھی مختصراً بیان کیا تھا اور یہ بات

---

(۱) سورۃ الکھف آیت ۱٦ ترجمہ: اور جب تم ان لوگوں سے الگ ہو گئے ور ان کے معبودوں سے بھی مگر اللہ سے تو تم غار میں چلکر پناہ لو تم پر تمہارا رب اپنی رحمت پھیلا دیگا اور تمہارے لیے تمہارے اس کام میں کامیابی کا سامان درست کر دیگا (بیان القرآن ج٦ ص۱۱۰) (۲) پوری تفصیل (۳) تراویح

بھی بتلائی تھی کہ حقیقت ان عبادات کی مجاہدہ اور بعض امراض باطنیہ کا معالجہ ہے کہ جس میں بعض امراض کا معالجہ[1] میں قیام لیل کو دخل ہے۔ اور بعض میں روزہ کو دخل ہے۔ اور یہ بھی بتلایا تھا کہ وہ حکم و مصالح جب مرتب ہوتے ہیں کہ جب حقوق ان کے ادا کیے جاویں۔ اور ان حقوق کو بھی بیان کیا تھا اور تمہید میں یہ بھی بیان کیا تھا کہ ان مجاہدات کی تکمیل کے لیے اور ان پر آثار مرتب ہونے کے لیے اکثر عادۃً ضرورت ہوتی ہے۔ ایک خاص طریق کی اور وہ طریق خلوت[2] ہے۔ اور یہ بھی بیان کیا تھا کہ وہ آثار کیونکر مرتب ہوتے ہیں اور یہ بھی کہ اس خلوت کا طریقہ اور دستور العمل بھی شریعت نے مقرر فرمایا ہے جس کا لقب اصطلاح شریعت میں اعتکاف ہے۔

ایک دن کا اعتکاف بھی غنیمت ہے

اعتکاف کے سوا اور سب مضامین تو مفصلاً بیان ہو چکے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تکمیل مجاہدات کو جس کا لقب اعتکاف ہے مفصلاً بیان کر دیا جائے۔ اور ہر چند کہ ترتیب کا مقتضیٰ یہ تھا کہ یہ مضمون اس جمعہ سے پہلے بیان کیا جاتا اس لیے کہ اعتکافِ مسنون کا وقت ۲۰ تاریخ کی شام سے ہے اور آج ۲۱ ہے۔ لیکن اب بھی غیر مناسب نہیں ہے۔ اس لیے کہ ابھی صرف ایک ہی شب گذری ہے جنہوں نے اعتکاف شروع کر دیا ہے ان کو تو عدم تقدم[3] بیان کا ظاہر ہے کہ مضر نہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ آیا مفید بھی ہے سو اس حیثیت سے ان کو یہ مضمون مفید بھی ہے کہ انہوں نے یہ اعتکاف شروع کر دیا ہے لیکن اس کی

---

(۱) بعض امراض کے علاج میں تراویح کو دخل ہے (۲) تنہائی (۳) اس بیان کو پہلے بیان نہ کرنا نقصان دہ نہیں

حقیقت سے آگاہی نہیں اس کو سن کر اس کی حقیقت منکشف[1] ہو کر زیادتی بصیرت حاصل ہوگی اور اس سے زیادہ خلوص ہوگا۔ اور جنہوں نے اعتکاف نہیں کیا ان کو البتہ عدم تقدم کے مضر ہونے کا احتمال[2] ہے لیکن مضر اس لیے نہیں کہ ان کو اگر دس دن نہیں ملے تو ایک دن کم تو مل سکتا ہے۔ بلکہ اگر حق تعالیٰ کے یہاں اگر مقبول ہوجائے تو ایک دن بھی کافی ہے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے ہیں۔

بس ہے اپنا ایک بھی نالہ اگر پہنچے وہاں
گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم

نیز ایک تدارک اس کا یوں ہوسکتا ہے کہ کوئی عبادت غیر فریضہ اگر فوت ہوجائے اور اس پر قلق اور افسوس ہو تو حق تعالیٰ اس پر بھی اتنا ہی ثواب عطا فرمادیتے ہیں کہ جس قدر اس عبادت کے کرنے سے ملتا ہے۔ بلکہ بعض بزرگوں سے تو بعض اوقات عبادتوں کی نسبت ایسے قصے منقول ہیں کہ انہوں نے دوسروں کے تاسف اور حسرت کو اپنی عبادت پر ترجیح دی ہے۔

ولی کو ولی کا پہچان لینا ضروری نہیں

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکل رہے تھے۔ ایک شخص ملا اور اس نے پوچھا کہ جماعت ہوچکی۔ حضرت ابراہیمؒ نے فرمایا کہ ہوچکی۔ اس نے ایک آہ سرد کھینچی۔ حضرت ابراہیمؒ نے فرمایا کہ تم اپنی آہ مجھ کو دیدو اور میری جماعت کا اجر تم لیلو۔ وہ شخص عارف تھا جیسا عنقریب اس کے جواب سے معلوم ہوگا۔ لیکن ابراہیم بن ادہمؒ نے باوجود کے کہ بڑے عارف کامل

---

(۱) حقیقت کھل جائیگی (۲) پہلے بیان نہ ہونا نقصان دہ ہوسکتا ہے

تھے اس شخص کو پہچانا نہیں اور یہ نہ پہچاننا کوئی عجیب بات نہیں اگرچہ مشہور تو یہ ہے کہ ولی را ولی می شناسد[1]۔ مگر یہ کلیۃً[2] صحیح نہیں، ہاں ولی را نبی می شناسد[3]۔ یہ صحیح ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ نسبتیں مختلف ہوتی ہیں ہر ایک ولی کی نسبت کا رنگ جدا ہوتا ہے۔ اس پر ایک اور حکایت یاد آگئی۔

حضرت خضر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں سمجھتا تھا کہ میں سب اولیاء اللہ کو پہچانتا ہوں لیکن ایک مرتبہ ایک مجمع تھا وہاں حدیثوں کا تذکرہ ہو رہا تھا اور وہاں ایک شخص علیحدہ نماز پڑھتا تھا میں نے اس سے کہا کہ بھائی تم اس مجمع میں کیوں شریک نہیں ہوتے وہ شخص صاحب حال تھے۔ انہوں نے جو جواب دیا وہ گویا بظاہر قواعد شرعیہ پر منطبق[4]۔ نہیں ہوتا مگر واقع میں خلاف نہیں۔ جواب یہ دیا کہ بتلاؤ یہ لوگ کس سے روایت حدیث کی بیان کرتے ہیں حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا سفیان اور اوزاعی[5]۔ وغیرہما سے کہا کہ جو خود اللہ تعالیٰ سے حدیث بیان کرے اس کو کیا ضرورت ہے کہ سفیان اور اوزاعی سے بیان کرے۔ خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کی دلیل کیا ہے کہ تم ایسے ہو۔ کہا کہ دلیل اس کی یہ ہے کہ میں تم کو پہچانتا ہوں اور تم مجھ کو نہیں پہچانتے، تم خضر ہو اور تم تو بتلاؤ کہ میں کون ہوں۔ خضر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اس روز مجھ کو معلوم ہوا کہ بعض اہل ولایت کو میں بھی نہیں پہچانتا، سچ ہے۔ اولیائی تحت قبائی لایعرفھم سوائی[6]۔ ایسے حضرات سے ارشاد اور تلقین بھی بہت کم ہوتا ہے مگر ان کو اس کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی، کہ ہم سے کسی کو نفع نہیں۔ حضرت احمد جامؒ اسی مضمون کو بیان فرماتے ہیں۔

---

(۱) ولی کو ولی پہچانتا ہے (۲) یہ اصول (۳) ہاں ولی کو نبی پہچانتا ہے (۴) شرعی قاعدوں پہ پورا نہیں اتر (۵) محدثین کے اسماء گرامی ہیں (۶) اولیاء اللہ میری چادر تلے ہیں ان کو میرے سوا کوئی نہیں پہچانتا

احمد تو عاشقی بمشیخت ترا چہ کار
دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

(اے احمد تو عاشق ہے تجھ کو بزرگی جتلانے سے کیا کام ہے تو دیوانہ رہ زنجیر خواہ ہو یا نہ ہو)

اور اس جواب کا واقع میں خلاف قواعد نہ ہونا اس طرح سے ہے کہ وہ حدیثیں مصلین ضروریہ کی نہ ہوں گی یا ان کو پہلے سے معلوم ہوں گی اور جس حالت میں وہ مشغول تھے وہ بحکم وقت ضروری ہوگا۔ اس ضروری کو حدیث من اللہ سے تعبیر فرما کر یہ جواب دیا۔ غرض حضرت ابراہیم بن ادہمؒ اتنے بڑے تو عارف کامل لیکن اس شخص کو نہ پہچانا۔

اسی طرح حضرت سلطان نظام الدین اولیا قدس سرہ کا ایک مسجد میں جو کہ ایک ویرانہ میں تھی گذر ہوا۔ منتظر تھے کہ کوئی آجاوے تو جماعت سے نماز پڑھ لیں لیکن وہاں ویرانہ تھا اس لیے امید نہ تھی کہ کوئی یہاں آئے گا مگر اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کی مراد پوری کرتے ہیں۔ میدہد یزداں مراد متقی(۱)۔ اس پر ایک حکایت اور یاد آگئی۔ ایک بزرگ تھے جماعت کے بڑے پابند تھے۔ سفر میں حضر(۲) میں کبھی ان کی جماعت فوت نہ ہوتی تھی۔ اور اگر سفر کرتے تھے تو ایسی طرح کرتے تھے کہ نماز کے وقت کسی مسجد میں جا پہنچیں۔ ایک مرتبہ سفر میں تھے اتفاقاً اس روز نماز کا وقت راستہ میں آگیا۔ گاڑی بان ہندو تھا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ آج میری جماعت فوت ہوتی ہے غیب سے کوئی سبب میری جماعت کا کر دیجیے ورنہ مجھ کو سخت قلق(۳) ہوگا، کہ مجھ سے برداشت نہ ہوسکے گا۔ اللہ تعالیٰ تو اپنے نیک بندوں کی مراد پوری فرماتے ہیں، گاڑی بان آیا اور عرض کیا

---

(۱) اللہ تعالیٰ متقیوں کی مراد پوری کر دیتا ہے (۲) سفر میں اور عدم سفر میں (۳) رنج

کہ حضرت مجھے مسلمان کرلیجیے۔ فرمایا تو کیوں مسلمان ہوتا ہے؟ کہا، کہ دفعۃً میرے جی میں آگیا ان بزرگ نے اس کو غسل دلایا اور کلمہ شہادت پڑھایا اور کہا کہ آؤ میرے برابر میں کھڑے ہو کر نماز پڑھو۔

الحاصل حضرت سلطان جیؒ کو بھی آرزو ہوئی کہ جماعت سے نماز پڑھوں، اتفاق سے ایک لکڑہارا موٹے جھوٹے کپڑے پہنے ہوئے مسجد میں آیا اور السلام علیکم کہا، سلطان جیؒ نے کہا میاں وضو کرلو کہنے لگا اے نظام الدین کیا مسلمان بھی بے وضو رہا کرتا ہے "الوضوء سلاح المومن"[1]۔ یہ تو مسلمان کی ادنیٰ بات ہے کہ باوضو رہے۔ حضرت بہت حیران ہوئے کہ یہ کون ہے کہ مجھ کو جانتا ہے اور میں نہیں جانتا۔ حضرت نے نظر بصیرت[2] سے جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ بڑا صاحب مقام شخص ہے۔ پس یہ ضروری نہیں کہ ولی کو ولی ضرور پہچانے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم بن ادہم نے اس آہ کرنے والے کو نہ پہچانا اس نے جواب دیا کہ میاں جاؤ کسی اور کو بہکانا میں ایسا مبادلہ[3] نہیں کیا کرتا۔ لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ حقیقت میں مبادلہ مقصود تھا یا مبادلہ کرنے سے مبادلہ ہوجاتا بلکہ مقصود اس کہنے سے اس کی اس حالت کے شرف[4] کا اظہار تھا اس لیے مقصود تمام اعمال سے اپنے اور اپنے اعمال پر سے نظر کے اٹھ جانے کا اور اپنا فقر اور عجز کا پیش نظر ہوجانا ہے، تو اس شخص کو اس وقت یہ صفت حاصل تھی اس لیے اس کی تمنا کی۔

---

(۱) وضوء مسلمان کا ہتیار ہے (۲) دل کی آنکھوں (۳) میں اسطرح اعمال کا تبادلہ نہیں کرتا (۴) مقصد اس حالت تأسف کے عمدہ ہونے کو ظاہر کرنا تھا

زندہ کو بھی ثواب بخشا جا سکتا ہے

لیکن یہ ہو سکتا ہے اور ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنے عمل کا ثواب مردہ کو یا زندہ کو دیدے جس طرح مردہ کو ثواب پہنچتا ہے اسی طرح زندہ کو بھی پہنچ جاتا ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حدیث شریف میں قصہ وارد ہوا ہے۔ کہ حضرت ابوہریرہؓ کے پاس چند شخص مقام ابذ کے آئے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے پوچھا کہ تمہارے یہاں ایک مسجد عشاء ہے کوئی ایسا ہے جو وہاں جا کر دو رکعت پڑھے اور یوں کہدے هذه لابی هريرة یعنی یہ دو رکعتیں ابوہریرہؓ کے لیے ہیں اور ظاہر ہے کہ صحابی کا غیر مدرک بالقیاس قول حکماً مرفوع ہوتا ہے[1]۔ پس حضرت ابوہریرہؓ کا یہ فرمانا مرفوع حدیث کے حکم میں ہے پس زندہ کو ثواب مل جاتا ہے۔ القصہ اس شخص نے حضرت ابراہیم بن ادہمؒ سے کہا کہ میاں جاؤ کسی بیوقوف کو بہکانا میری آہ کا وہ ثواب ہے کہ میں تمام جہان کے عوض میں بھی نہ بدلوں۔ مگر یاد رکھو وہ عارف تھا اس کو اپنی آہ کا ثواب مکشوف ہوا ہوگا اس لیے کوئی ذہین آدمی یہ استنباط نہ کرے کہ یہ تو بہت سہل نسخہ بتلا دیا بس نماز روزہ کی جگہ آہ ہی کر لیا کریں گے اس لیے کہ یہ تو اس شخص کا حال تھا کہ باوجود کوشش کے کے نیک عمل اس سے فوت ہو گیا ہو۔ بہر حال اگر ایک دن فوت ہو گیا ہے تو اعتکاف کی فضیلت سن کر جس شخص کو ایک دن کے فوت ہونے پر حسرت ہوگی اس کا تدارک اس طور سے ہو جاوے گا پس یہ مضمون دونوں فریق کے لیے نافع ہے۔

---

(۱) جب کوئی صحابی کوئی ایسی بات بیان کرے کہ جو کسی حکم شرعی پر قیاس نہ کیجا سکے تو صحابی کا یہ قول حدیث مرفوع کے حکم میں ہوتا ہے گویا یہ حضور کا ارشاد ہوگا جو اس نے سنا ہوگا لیکن بغیر آپ کا نام لیے ذکر کر دیا کیونکہ صحابہ کے بارے میں ارشاد ہے الصحابة کلهم عدول

اسلام کی حقانیت کی دلیل

اب مقصود شروع ہوتا ہے۔ اعتکاف کی حقیقت تو میری تقریر سابق سے معلوم ہو گئی ہو گی کہ حقیقت اس کی خلوت[۱] ہے۔ لیکن مطلق خلوت نہیں ہے بلکہ خاص خاص حکمتوں اور خاص خاص قیود و شروط کے ساتھ یہی امتیاز ہے[۲] اس کو حکماء و جوگیہ کی خلوتوں سے، یہ اعمال ان کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں لیکن ہمارے یہاں مکمل ہیں اور ان کے یہاں ناتمام اور غیر مکمل ہیں۔ چنانچہ پہلے اس مضمون کو بھی بیان کیا گیا ہے جس طور سے یہاں مقرر کیا گیا ہے حکماء کا ذہن وہاں کیسے پہنچ سکتا ہے میرے چھوٹے بھائی نے ایک ملحد کو خوب جواب دیا تھا، اس نے کہا تھا کہ ہمارا دین معقول ہے۔ اس کے سب مسائل عقل کے موافق سمجھ میں آتے ہیں اور تمہارے مذہب کے بہت سے مسائل عقل سے سمجھ نہیں نہیں آتے۔ بھائی نے کہا یہی دلیل ہے اس بات کی کہ ہمارا مذہب سچا ہے جبکہ ہمارے نوکروں کو ہمارے خانگی اسرار تک رسائی نہیں[۳]۔ اور ان کی عقل میں نہیں آتے حالانکہ ان کو ہم سے نسبت ہے کہ وہ اور ہم حقیقت واحدہ[۴] میں شریک ہیں تو بندہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے اسرار پر کیسے مطلع ہو سکتا ہے[۵]۔ آسمانی اور الٰہی مذہب کی علامت ہی یہ ہے کہ اس کی کوئی بات تو سمجھ میں آوے اور کوئی نہ آوے اور اگر ہر بات سمجھ میں آجاوے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے جیسے آدمیوں کا بنایا ہوا ہے کہ ان کے اسرار تک[۶] ہماری رسائی بھی ہو سکتی

---

(۱) تنہائی (۲) بلکہ ایسی تنہائی ہے کہ جس میں بہتسی حکمتیں ہیں جیسے ملائکہ کی معیت نیک لوگوں کی صحبت اور اللہ کے گھر میں قیام وغیرہ اور بہت سی شرطیں ہیں جیسے ایسی مسجد میں اعتکاف کرنا جس میں جماعت ہوتی ہو مسنون اعتکاف کیلیے رمضان کا عشرہ آخیرہ میں ہونا وغیرہ۔ (۳) ہمارے نوکر ہماری گھریلو رازکی باتیں نہیں جان سکتے (۴) جبکہ ان کی اور ہماری حقیقت ایک ہی ہے یعنی وہ بھی انسان ہم بھی انسان (۵) جبکہ بندہ اور اللہ کی حقیقت میں کوئی مناسبت ہی نہیں (۶) ان کی حکمتوں تک ہمارا ذہن بھی پہنچ سکتا ہے۔

ہے۔ بس اللہ تعالیٰ کی وضع[1] کی برابری کسی حکیم و فلسفی کی وضع کیسے کر سکتی ہے۔

خلوت میں یکسوئی کیوجہ

غرض وہ لوگ بھی مجاہدات کی اعانت کے لیے خلوت اختیار کیا کرتے تھے اور حکمت اس میں یہ ہے کہ خلوت میں جمعیت اور یکسوئی ہوتی ہے اور اسی پر مدار ہے تمام مجاہدات کے ثمرات[2] کا اور خلوت میں یکسوئی اس لیے ہوتی ہے کہ پریشانی قلب[3] کے اسباب مختلف ہیں۔ بعض آفاقی ہیں بعض انفسی[4] ہیں یا یوں کہو کہ بعض خارجی ہیں بعض داخلی یعنے بعضے اسباب تو ایسے ہیں کہ اس شخص کے اندر وہ نہیں ہیں بلکہ خارج سے اس کو لاحق ہوتے ہیں اور بعض اسباب ایسے ہیں کہ خود اس کے نفس کے اندر ہیں لیکن منشاء ان کا بھی کوئی امر خارجی[5] ہی ہے اور خلوت میں سب قطع[6] ہوجاتے ہیں۔ اور جو نفس میں باقی بھی رہتے ہیں وہ بھی خارج ہی سے حاصل شدہ ہوتے ہیں[7]۔ دیکھیے مجمع میں جب آدمی ہے تو ہر قسم کی صورتیں اس کو نظر آتی ہیں اور ہر قسم کی باتیں سننے میں آتی ہیں کوئی ناگوار بات معلوم ہوتی اور کوئی گوارا ہوتی ہے۔ بعض اوقات سخت سخت پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں اور خلوت میں یہ سب کم ہوجاتے ہیں اسی واسطے حضرت شیخ فرماتے ہیں۔

بزرگے دیدم اندر کہسارے   قناعت کردہ از دنیا بغارے

---

(۱) اللہ تعالیٰ کے متعین کردہ احکام کے برابر کسی فلسفی کے احکام کیسے ہوسکتے ہیں (۲) تمام مجاہدات کا نتیجہ اسی پر مرتب ہوتا ہے (۳) دل (۴) دل کی پریشانی کبھی جسم کے اندرونی اسباب سے ہوتی ہے کبھی بیرونی (۵) بیرونی (۶) سب ختم ہوجاتے ہیں (۷) باہر ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔

(میں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ ایک پہاڑ کے غار میں دنیا سے قناعت کیے ہوئے بیٹھے تھے)

چرا گفتم بشہر اندر نیائی   کہ بارے بندے از دل برکشائی

(میں نے پوچھا کہ آپ شہر میں کیوں نہیں آتے تاکہ دل کی گرہ ایک بار کھلے)

بگفت آنجا پریرویاں نغزند   چو گل بسیار شد پیلاں بلغزند

(اس نے کہا کہ وہاں بڑے خوبصورت پری رو ہیں، اور ظاہر میں گل پھول جہاں زیادہ ہوجائیں وہاں ہاتھی بھی لغزش کرتے ہیں)

بڑی بڑی آفتیں اور بڑے بڑے واقعات مجمع میں بیٹھنے سے پیش آجاتے ہیں تو پریشانی کے تمام اسباب خارج ہی سے آتے ہیں باقی رہی یہ بات کہ کوئی کہے کہ خلوت میں بھی تو پریشانی ہوتی ہے اس لیے کہ ذہن میں حسینوں کی مثلاً صورتیں ہیں یا کسی اور شی کی صورت ہے وہ قلب[1] کو پریشان کرتی ہے بات یہ ہے کہ وہ صورتیں بھی خارج ہی سے آئی ہیں اس لیے کہ ان حسینوں کو دیکھا ہے اس لیے پریشانی ہوتی ہے اور اگر خلوت میں رہتا اور نہ دیکھتا تو ہرگز پریشانی نہ ہوتی پس خلوت میں بیٹھ کر جو صورتیں پریشان کرتی ہیں وہ بحیثیت ذہن میں ہونے کے پریشان کن نہیں ہیں بلکہ بحیثیت اس کے کہ **انها مستفادة عن الخارج باعث تشتت**[2] ہوئی ہیں ورنہ اگر بغیر کسی کو دیکھے ہوئے خود ذہن کسی حسین کی صورت تراشے تو ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ خواہ احسن سے احسن صورت کا اختراع کرے[3] ہرگز وہ قلب[4] کو پریشان نہ کرے گی، پس یہ آفت لگائی ہوئی صورت خارجیہ ہی کی ہے پس پریشانی باطنی ہمیشہ سبب ظاہری کا مسبب

---

(۱) دل (۲) اس حیثیت سے باعث پریشان ہیں کہ وہ باہر ہی سے ذہن میں آئی ہیں (۳) اچھی سے اچھی صورت گھڑ لے (۴) دل کو ہرگز پریشان نہیں کریگی۔

ہوتی ہے اور خلوت میں چونکہ وہ اسباب منقطع ہوجاتے ہیں اس لیے وہی ذخیرہ رہ جاتا ہے جو پہلے سے قلب میں ہوتا ہے، آئندہ کو آمدنی بند ہوجاتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ بقیہ بھی نکل جاتا ہے۔

حسن پرستی سے نجات کی صورت

چنانچہ جس وقت خلوت میں بیٹھا ہوا یہ کسی صورت کو سوچ رہا تھا تو اس وقت اس کا تصور ضعیف[1] تھا اگر عین تصور کے وقت وہی حسین وہاں گذر جائے تو ایک بجلی سی دل پر گرے گی اور وہ پریشانی اور زیادہ ترقی پذیر ہوگی۔ اور اگر اس سے بھاگے اور اپنے پاس نہ آنے دے قصداً خیال کو نہ لاوے اور اگر خیال خود آوے تو فوراً دوسرے خیال کو غالب کردے تو چند روز اس پر عمل کرنے سے وہ خیال خود ضعیف ہو کر قلب سے نکل جائے گا اور پریشانی جاتی رہے گی یہ جو لوگ مدتوں پریشان رہتے ہیں اپنے ہاتھوں رہتے ہیں ورنہ وہ صورت تو خود بخود زائل ہوجاتی ہے خود بیٹھ کر سوچتے ہیں اور اس سے مزے لیتے ہیں اور ملنا بولنا دیکھنا یہ چھوڑتے نہیں اس لیے یہ بلا اور زیادہ لازم ہوجاتی ہے شیخ نے جو بوستاں میں باب عشق میں لکھا ہے اس کی نسبت وہ لکھتے ہیں۔

باب سوم عشق است بستی وشور   نہ عشقے کہ برخود نہ بندند بزور

یعنی تیسرا باب عشق حقیقی کے بیان میں ہے وہ عشق مراد نہیں جس کو زبر دستی اپنے اوپر لپیٹ لیں، اس سے خود معلوم ہوگیا کہ عشق مجازی کو لوگ اپنے ہاتھوں اپنے اوپر لادتے ہیں خود بخود نہیں ہوتا اور جو بلا قصد بھی ہوجاتا ہے تو اس کو اسی حد تک قائم رکھ کر اس کے دفع[2] کرنے کی فکر نہیں کرتے بلکہ محبوب

---

(۱) کمزور (۲) دور

کے ملنے اور بولنے اور دیکھنے کی تمنائیں کرتے ہیں ایسے ہی عشق کی نسبت کوئی حکیم فرماتے ہیں۔

این نہ عشق است اینکہ در مردم بود

این فساد از خوردن گندم بود

(یہ عشق جو آدمیوں میں پایا جاتا ہے یہ عشق نہیں بلکہ دراصل گندم کھانے کا فساد ہے) اگر دفع کرنا چاہتے تو دفع ہو سکتا تھا۔

گناہوں میں لذت کی حقیقت

اس کی ایسی مثال ہے جیسے تمباکو کہ ایک مرتبہ کھایا طبیعت پریشان ہوئی سر چکرایا بے ہوش ہوگئے۔ اب مناسب یہ تھا کہ پھر اس کے پاس نہ جاتے لیکن پھر کھاتے ہیں حتیٰ کہ رفتہ رفتہ ایسی عادت ہوجاتی ہے کہ پھر چھوٹتی نہیں اسی طرح افیون اور شراب کی عادت ہے۔ بعض کو جوتے کھانے میں مزہ آتا ہے کہ بغیر جوتے لگے ان کی تسلی نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ مصالحہ طلب کہلاتے ہیں اپنا اپنا مزہ ہے کسی کو کہیں مزہ آتا ہے کسی کو کہیں میں، ہم تو اس کو بے حسی سے تعبیر کریں گے جیسے ایک غیر ملکی گنوار ہندوستان کی سیر کے لیے آیا۔ ایک حلوائی کی دوکان پر پہنچا اور بغیر اجازت کھانا شروع کیا حلوائی نے پولیس کو اطلاع کی پولیس والوں نے یہ سزا تجویز کی کہ اس کا منہ کالا کر کے اور گدھے پر سوار کر کے اس کو تمام شہر میں گھمایا جاوے اور پیچھے پیچھے لڑکے تالیاں بجاویں، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا جب یہ اپنے ملک پہنچے تو اہل وطن نے پوچھا آغا ہندوستان رفتہ بودی چہ طور یافتی [۱] کہ ہندوستان خوب ملک است حلوہ خوردن مفت است سواری خر مفت

---

[۱] اے دوست آپ ہندوستان گئے تھے آپ نے کیسا پایا

است فوج طفلاں مفت است ڈھم ڈھم مفت است ہندوستان خوب ملک ہے[1] تو جیسے ان آغا صاحب کو اپنی رسوائی اور بے آبروئی کی حس نہیں ہوئی اسی طرح لوگوں کو معاصی میں مزہ آتا ہے اور جو اس میں کدورت اور پریشانی ہے اس کا ادراک نہیں ہوتا۔

عشق مجازی کا وبال

بہر حال اس عشق مجازی میں یہ صفت ہے کہ یہ سریع الزوال[2] ہوتا ہے بشرطیکہ کوئی مقوی[3] اس کو نہ پہنچے اس کی ایسی مثال ہے جیسے سلیٹ پر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ خود بخود مٹ جاتا ہے اسی طرح ذہن میں جو صورت آجاتی ہے اگر اس کو جمایا نہ جاوے تو وہ خود بخود محو[4] ہو جاوے گی ہاں اگر چاقو سے سلیٹ پر حرف لکھ لیے تو ان کو زائل ہونا واقعی مشکل ہے اسی طرح اگر مراقبہ کر کر کے اس صورت کو جمایا جاوے تو اس کا زوال مشکل ہے بلکہ نہیں نکلتی حتی کہ مرنے کے وقت بھی نہیں جاتی۔ ایک شخص کسی مرد پر عاشق تھا اور وہ اس سے ملتا نہیں تھا رنج فراق میں گھل گھل کر مرنے کے قریب ہو گیا اور مایوسی کی نوبت پہنچ گئی۔ اور نزع کا وقت آگیا کسی نے جا کر اس کو خبر کی کہ ظالم اس کی یہ کیفیت ہے ذرا چل کر اس کو دیکھ تو لے، اس کو خیال آگیا چنانچہ ملنے کے لیے چلا اس کو کسی نے دوڑ کر خبر کی کہ تمہارا محبوب آرہا ہے۔ یا تو یہ حالت تھی کہ مر رہا تھا اور دم توڑ رہا تھا اور یا ایسی طاقت آئی کہ اٹھ بیٹھا اور اس لڑکے کا تھوڑی دور چل کر خیال بدل گیا اور کہا کہ میں

---

(۱) بولے کہ ہندوستان بہترین ملک ہے حلوا کھانے کو مفت ملتا ہے گدھے کی سواری مفت ہے بچوں کی فوج مفت ملتی ہے ڈھول ڈھماکہ مفت ہے ہندوستان بہترین ملک ہے (۲) جلدی زائل ہونے والا (۳) بشرطیکہ اس کو طاقت دینے والی کوئی چیز نہ پہنچے (۴) مٹ جاتا ہے۔

تو بدنام ہونا نہیں چاہتا یہ کہہ کر واپس ہو گیا۔ عاشق کو اس کی خبر پہنچی سنتے ہی فوراً گر گیا اور جانکنی[1] شروع ہو گئی۔ لوگوں نے کہا کہ تو کلمہ پڑھ لے۔ بجائے کلمہ کے یہ شعر پڑھا۔

رضاک اشھی الی فوادی　　من رحمتہ الخالق الجلیل

یعنی اے محبوب تیری رضامندی میرے دل کو خالق جلیل کی رحمت سے زیادہ مرغوب ہے اور اسی پر دم نکل گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ کمبخت نے ایمان بھی کھویا اور محبوب بھی نہ ملا۔ حضرت یہ بڑی آفت کی پڑیہ ہے، قلب میں جب رچ جاتی ہے تو اس سے جو کچھ بھی آفتیں آویں کم ہیں۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو غیرت آتی ہے کہ میرا چاہنے والا میرا پیدا کیا ہوا اور دوسرے کی طرف مائل ہو اس لیے سب نعمتیں سلب ہو جاتی ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات کفر پر خاتمہ ہوتا ہے جیسے اس شخص کی کیفیت ہوئی۔

عشق مجازی سے نجات کی صورتیں

کانپور میں ایک بزرگ تھے وہ بیان کرتے تھے کہ میں جوانی کی عمر میں لکھنؤ میں ایک مرتبہ ناچ میں چلا گیا وہاں ایک بازاری عورت پر جو نظر پڑی بس دل ہاتھ سے نکل گیا اور اس قدر فریفتگی کا غلبہ ہوا کہ بیوی، بچوں کو چھوڑ اس کے پیچھے ہو لیے اور میں ایک بزرگ کی خدمت میں بھی جایا کرتا تھا۔ صاحبو! بزرگوں سے علاقہ قطع نہ کرو ان کو گلے لپٹے رہو یہ عجیب کیمیا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بزرگوں کے پاس جانے سے لگتا ہے ان سے کوئی پوچھے کہ ڈر کس بات کا لگتا ہے وہ کسی کو مارتے ہیں یا بھیڑیے پھاڑ کھاویں گے بیش برس نیست[2] کہ تمہاری بے تمیزی پر برا بھلا

---

(۱) نزع کی کیفیت (۲) اس سے زائد کچھ نہیں کہ

کہہ لیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنے کو بڑا اور شاندار جانتے ہو۔ میاں ہماری تمہاری شان ہی کیا ہے عقیدت اور محبت کی بات تو یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہیں سب گوارا کرے، بلکہ اگر مار بھی بیٹھیں اس کو بھی جھیل جاوے"[1]۔ ڈرے گا ہمیشہ وہ شخص جو اپنے کو شاندار سمجھتا ہوگا اور یہی سمِ قاتل[2] ہے۔ اور جو ساری باتوں پر آمادہ ہو اس کو کس بات کا ڈر ہوگا۔ نہ ڈرے نہ شرمائے ایسی ہی شرم کی نسبت کسی نے کہا ہے، جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم، غرض ان کو چھوڑو مت، الحاصل اس شخص کی خوبی یہ تھی کہ اس روز بھی ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بار بار چاہتا تھا کہ اپنا دکھ ان سے کہوں لیکن زبان نہ اٹھتی تھی ان بزرگ کو اس کا انکشاف ہوا انہوں نے خود فرمایا کہ ہماری طرف متوجہ ہو جاؤ۔ چنانچہ وہ متوجہ ہو گیا پہلے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس بازاری عورت کا پتلا میرے اندر اتر گیا ہے اس کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ان بزرگ نے اس کا سر کاٹ کر اور نکال کر پھینک دیا اس کے بعد ہاتھ پھینک دیے اسی طرح اس کا ایک ایک جزو نکال دیا اور قلب بالکل آئینہ کی طرح ہو گیا یہ بھی ایک تدبیر اس مرض کے زوال کی ہے اس کے علاوہ اور تدبیریں بھی ہیں۔

عشق مجازی سے نجات کی آسان ترکیب

ذکر اللہ کی کثرت بھی نہایت بہتر تدبیر ہے اور میں تو اس کی بہت آسان تدبیر یہ بتلایا کرتا ہوں کہ اگر ذکر نہ ہو سکے تو یوں کرو کہ جس طرح اس حسین کو دیکھا ہے ایسے ہی کسی بہت برے بد شکل کو بھی دیکھو اور اس کا تصور کرو انشاء اللہ تعالیٰ جاتا رہے، اور راز اس میں یہ ہے کہ یہ فلسفی مسئلہ ہے کہ جب آدمی ایک خیال

---

(۱) برداشت کرے (۲) ہلاکت کو زہر

قلب میں جمالیتا ہے تو وہ خیال ماضی کا دافع[1] ہو جاتا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ ماضی اگر گیا تو مستقبل آیا۔ فائدہ کیا ہوا۔ بات یہ ہے کہ وہ مستقبل چونکہ کسی حسین کا تصور نہیں ہے۔ بلکہ بد شکل کا ہے اور بطریق معالجہ ہے اس لیے وہ تصور راسخ نہ ہو گا دوسرے کو دفع[2] کر کے خود بھی دفع ہو جائے گا۔

تصور شیخ کی حکمت

اور یہی حکمت ہے تصور شیخ میں کہ اس سے اور خیالات زائل ہو جاتے ہیں اس لیے کہ شیخ محبوب ہوتا ہے اور محبوب کی شکل کا تصور بھی آسان ہوتا ہے۔

وساوس کا علاج تصور امرد یا مراۃ سے کرانا غلطی ہے

بعض لوگ لڑکوں اور عورتوں کے تصور سے خطرات کا علاج کرتے ہیں، یہ سخت غلطی اور دھوکہ ہے یہ تو مرض کو اور بڑھانا ہے اور وجہ اس دھوکہ کی یہ ہوتی ہے کہ حسن پرستی میں ان لوگوں کو ایک مزہ آتا ہے اور جب وہ کوئی طاعت کرتے ہیں مثلاً نماز پڑھتے ہیں تو اس حالت میں بھی ایک لطف آتا ہے تو سمجھتے ہیں کہ نماز میں ہم کو مزہ آرہا ہے، حالانکہ وہ نماز کی حلاوت[3] نہیں ہے وہ اس حسن پرستی کی طبعی لذت ہے۔ ایک شخص کہنے لگے کہ ایک روز ایک طوائف گا رہی تھی اسی حالت میں نماز کا وقت آگیا اس روز نماز میں ایسا مزہ آیا ہے کہ کبھی نہ آیا تھا بہت حضور قلب میسر ہوا۔ تو یہ حضور قلب[4] نہیں حضور کلب[5] ہے بلکہ حضور کلبہ[6] جس نماز میں کتیا کا تصور ہو وہ کیا نماز ہوئی۔

---

(۱) پہلے خیال کو دور کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے (۲) دور کر کے (۳) مٹھاس (۴) دل حاضر ہونا (۵) کتا حاضر ہونا (۶) بلکہ کتیا حاضر ہے۔ طوائف کی نسبت سے اس کو کلبہ کہا۔

حکایت

کتیا پر ایک حکایت یاد آئی۔ ہم سبعہ معلقہ[1] پڑھتے تھے اس میں شعر ہے لخولة اطلاله ببرقة ثهمد۔ جب اس کا امتحان ہوا تو ہماری جماعت میں سے ایک طالب علم نے اس کا یہ ترجمہ کیا، کتیا کے لیے مقام ثہمد میں نشان دار ہیں۔ استاد نے تعجب سے اس ترجمہ کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ خولہ نیچے محشی[2]۔ نے یہ لکھدیا تھا امراہ من بنی کلب[3] بھلے مانس نے بنی کلب سے کتے کی اولاد بہر حال کتا ہو یا کتیا ہو نہ نماز کے اندر اور نہ خارج میں کسی طرح تصور نہ کرے بعض لوگ مردوں کے گھورنے کو قرب الہی میں موثر سمجھتے ہیں استغفر اللہ یہی لوگ ہیں جنہوں نے طریق کو بدنام کیا ہے، شہوت پرستی کا نام قرب رکھا ہے۔ بعض لوگ گھورنے والوں کا علاج بھی کردیتے ہیں۔ حضرت مولانا فخر نظامیؒ بڑے حسین و جمیل نوجوان تھے اور ابتداء ہی سے حق تعالیٰ نے دولت نسبت باطنی سے ان کو مشرف فرمایا تھا، دہلی میں تشریف لائے غل مچ گیا کہ بڑا حسین لڑکا آیا ہے بہت سے شہدے گھورنے کے لے آئے۔ مولانا جامع مسجد سے نماز پڑھ کر اتر رہے تھے کہ ایک جماعت کی جماعت سامنے آئی۔

حضرت کو منکشف ہوا کہ گھورنے آئے ہیں۔ ایک نظر اٹھا کر دیکھا سب گر گئے فرمانے لگے آؤ گھورتے کیوں نہیں۔

مرد کا حسن داڑھی سے ہے

سب سے زیادہ خداوندی قلعہ اس سے بچاؤ کا داڑھی ہے کہ جب داڑھی نکل

---

(۱) کتاب کا نام ہے (۲) حاشیہ لکھنے والے نے (۳) بنی کلب کی عورتوں میں سے ایک عورت

آتی ہے سب آفتوں سے حفاظت ہوجاتی ہے لیکن ہمارے نوجوان اس قلعہ کو بھی ڈھاتے ہیں یعنی داڑھی کا صفایا کراتے ہیں اول اول تو اس لیے منڈاتے ہیں کہ حسن محفوظ رہے اور پھر عادت ہوجاتی ہے اگر کوئی ناصح نصیحت کرتا ہے تو کہتے ہیں۔

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلمان ہوں گے

اور بعضے اہل یورپ کی تقلید کرتے ہیں۔ سنا ہے کہ انگلستان میں داڑھی رکھنے کے متعلق گفتگو ہورہی تھی اگر داڑھی کا رکھنا طے ہوا تو اسے فیشن پرستو تم کو بھی اس وقت رکھنا پڑیگی، لیکن افسوس اس بات کا ہوگا کہ خدا اور رسول ﷺ کے کہنے سے تو نہ رکھی ہاں غیر قوموں کی تقلید سے رکھو گے۔ غرض یہ ایک خداوندی قلعہ ہے اور نیز حسن کی حفاظت منڈانے میں نہیں ہے بلکہ مرد کا حسن تو داڑھی سے ہے۔ الغرض اس قسم کی آفتیں مجمع میں پیش آجاتی ہیں۔ بہرحال جو سبب بھی قلب کا پریشان کرنے والا ہے اس کا مرجع خارج ہے خلوت کے اندر ان سب آفتوں سے حفاظت رہتی ہے جو پچھلی پریشانی ہے وہ کمزور ہوکر چند روز میں خود جاتی رہے گی اور آئندہ کو کوئی سبب پریشانی کا نہیں ہے اس لیے قلب بالکل صاف ہوکر آئینہ کی طرح ہوجائے گا اور اس میں استعداد پیدا ہوگی۔

فیوض باطنیہ کے حصول کا طریقہ اور چشم بند و گوش بند کے معنی

فیوض باطنیہ کے حاصل کرنے کی نسبت مولانا فرماتے ہیں۔

قعر چہ بگزید ہر کہ عاقلست　　　زانکہ در خلوت صفا ہائے دلست

(جو عقلمند ہے وہ گمراہی کیوں اختیار کرتا ہے اس لیے کہ خلوت میں قلب کی صفائی حاصل ہوتی ہے)

یہ صورت ہے خلوت کے معین ہونے کی مولانا دوسرے مقام پر فرماتے ہیں۔

چشم بند و لب ببند و گوش بند　　　گر نہ بینی نور حق بر ما بخند

(اپنی آنکھیں بند کرلو منہ سی لو اور کان بند کرلو اور پھر بھی اگر اللہ تعالیٰ کا نور نہ دیکھو تو پھر ہم پر ہنسو)

بعض لوگوں نے غلو کیا ہے کہ اس شعر سے حبس دم کا شغل[۱] استنباط کیا ہے کہ اس شغل میں آنکھیں اور کان بند کرلیتے ہیں۔ حاشا کلا[۲] مولانا کی یہ مراد نہیں ہے گو خود شغل قابل[۳] انکار نہیں لیکن شعر کا مطلب یہ ہے کہ آنکھیں بند کرلو معاصی اور فضولیات سے جیسا حضور ﷺ کو خطاب ہے لاتمدن عينيك الى ما متعنا به ازواجا منهم[۴]۔ یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ مائل مت ہو بلکہ یہ ارشاد ہے کہ کفار کے متاع[۵] کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی مت دیکھو۔ اس سے معلوم ہوا کہ فضول نگاہ بھی بچنے کے قابل ہے۔ مولانا رفیع الدین صاحبؒ مہتمم مدرسہ عالیہ دیوبندؒ۔ کے والد ماجد صاحب بڑے بزرگ تھے ہر وقت نگاہ نیچی رکھتے تھے۔ اپنے پاس آنے والوں کو بھی نظر اٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ لوگوں نے اس کا سبب پوچھا، فرمایا کہ دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جن کو میں پہچانتا ہوں اور ایک وہ جن کو نہیں پہچانتا جن کو پہچانتا ہوں آواز سے پہچان لیتا ہوں اور جن کو نہیں

---

(۱) سانس روکنے کا طریقہ جعض صوفیا نے نکالا ہے (۲) ہرگز مولانا کی یہ مراد نہیں (۳) اگرچہ یہ طریقہ قابل انکار نہیں لیکن اس شعر سے استنباط درست نہیں (۴) سورۃ الحجر آیت ۸۸۔ آپ اپنی آنکھ اٹھا کر بھی اس چیز کو نہ دیکھیے جو ہم نے مختلف قسم کے کافروں کو برتنے کے لیے دے رکھی ہیں (۵) سامان۔

پہچانتا دیکھنے سے بھی نہیں پہچانتا بس فضول کیوں دیکھوں۔ یہ حضرات جس طرح مال میں اسراف[۱] نہیں کرتے افعال میں بھی اسراف نہیں کرتے اپنے افعال کو منضبط رکھتے ہیں یہ معنی ہیں چشم بند کے اور گوش بند کے[۲] یہ معنی ہیں کہ کانوں کو بھی معاصی[۳] اور فضولیات کے سننے سے روکو۔

سماع کی حقیقت

اس مقام میں سماع کے متعلق سمجھو کہ اس میں بعض یہ عذر کرتے ہیں کہ جب گناہ نہیں ہے تو حرج کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ سلمنا[۴] گناہ نہیں ہے لیکن کوئی نفع بھی اس کے اندر نہیں بتلاسکتا، بہت سے بہت کوئی بڑی عرق ریزی سے مضر[۵] نہ ہونا ثابت کرے گا لیکن نافع ہونا تو کوئی ثابت ہی نہیں کرسکتا، اور بڑی صاف دلیل اس کے نافع نہ ہونے کی یہ ہے کہ کسی شیخ کے باوجود صاحب سماع[۶] ہونے کے اپنے مریدوں کو اسکی تعلیم نہیں دی، کہیں کتب تصوف میں اور بزرگوں کے ملفوظات میں اس کا نشان نہیں کہ کسی شیخ نے اپنے مرید کو یہ کہا ہو کہ گانا سنا کرو۔ پس جو شے ایسی ہو کہ اس میں نہ نفع ہو نہ نقصان، وہ فضول ہے اور فضول کا چھوڑنا ہمارے اسلام کی تعلیم ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے **من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه**[۷]۔ اور حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں **واللذین هم عن اللغو معرضون**[۸]

---

(۱) فضول خرچی (۲) آنکھ بند اور کان بند کے یہ معنی ہیں (۳) گناہوں (۴) ہم نے آپ کی یہ بات تسلیم کی (۵) بہت کوشش کے بعد نقصان دہ نہ ہونا ثابت کریگا (۶) خود سماع سننے کے باوجود (۷) اسلام کی خوبی یہ ہے کہ بیکار باتوں کو چھوڑ دیا جائے (۸) اور وہ لوگ جو بیکار باتوں سے احتراز کرتے ہیں۔

گانا سننے کا نقصان

اور یہ گفتگو تنزلاً ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے، کہ یہ مضر[۱] ہے اس کا اثر قلب پر اچھا نہیں ہوتا اور اسکا امتحان یہ ہے کہ جو شخص گانا سنتا ہو وہ چار ماہ کے لیے اللہ کا نام لے اور نفلیں پڑھے اور قرآن پڑھے اور سنے، اور گانے کو یک لخت ترک کردے اسکے بعد اپنی پہلی حالت اور اس وقت کی حالت کا اندازہ کرے کہ آیا اس وقت نماز اور قرآن اور ذکر میں جی زیادہ لگتا تھا یا اب زیادہ لگتا ہے۔ واللہ گانا سننے کے زمانہ میں وہ اپنی حالت یہ پائے گا کہ اس کو بجز گانے کے نہ قرآن میں نہ ذکر میں نہ نماز میں کہیں میں لطف نہ آتا تھا اور اب ہر شے میں حلاوت محسوس ہوگی۔ ایسی ہی گانا سننے کی نسبت حدیث میں آیا۔ **الغناء ینبت النفاق فی القلب**[۲] اور کما قال[۳] یعنی راگ قلب میں نفاق کو اگاتا ہے، اور قلب کا ضرر[۴] وہ چیز ہے جس کی نسبت مولانا فرماتے ہیں۔

بردل سالک ہزاراں غم بود　　　گر زباغ دل خلالے کم بود

(اگر سالک کے دل کے باغ سے ایک تنکا بھی کم ہوجائے تو سالک کو ہزاروں غم لاحق ہوجاتے ہیں)

حالانکہ یہ کمی جس کو مولانا فرمارہے ہیں میں کوئی شرعی اور معتد بہ[۵] کمی نہیں بلکہ خیالی اور وہمی کمی ہے، یعنی واردات کے بند ہوجانے اور قبض کے پیش آجانے کے سبب جو کم ہوجاتی ہے اس کمی پر فرمارہے ہیں، کہ ہزاروں غم قلب پر مستولی[۶] ہوجاتے ہیں بلکہ یہ غم یہاں تک ہوا ہے کہ بعضوں نے خودکشی کرلی

---

(۱) اور یہ گفتگو تو آپ کی بات کو تسلیم کرنیکی صورت میں ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ گناہ ہے (۲) گانا دل میں نفاق پیدا کرتا ہے (۳) یا جیسا حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا (۴) دل کا نقصان (۵) قابل شمار (۶) دل پر چھا جاتے ہیں۔

ہے، اور نماز اور قرآن میں جی نہ لگتا تو بڑا بھاری خسارہ ہے اللہ کے نام میں کسی کو لطف نہ آوے اس سے زیادہ کون خسارہ میں ہوگا، یہ تو وہ نام ہے۔

اللہ اللہ این چہ شیریں است نام　　　شیر و شکر می شود جانم تمام

(اللہ اللہ یہ کیسا اچھا نام ہے کہ میری جان تمام شیر و شکر ہو رہی ہے)

اور یہ تو ان کا حال ہے جن کو ناتمام لطف ہے، اور جن کو پورا ادراک ہے وہ تو یوں کہتے ہیں کہ افسوس سلاطین اس دولت سے محروم ہیں، شب و روز سلاسل و اغلال[1] کے اندر مقید ہیں، مگر خبر نہیں حس نہیں۔ اے اہل تنعم[2] یہ سامانِ دنیا کا اس غیر مکی کا حلوا ہے اور سواری خر ہے۔

فسوف ترى اذا انكشف الغبار　　　افرس تحت رجلك ام حمار[3]

جیسے اس گنوار کو اس حلوے اور گدھے کی سواری میں مزہ آرہا تھا اہل حقیقت کے نزدیک یہی حالت ہے ہم پریشانی میں ہیں اور اس کی حس نہیں۔ ولا تعجبك اموالهم ولا اولادهم انما يريد الله ليعذبهم بها في الدنيا[4]۔ سچ ہے یہ دنیا کا مال اور اولاد دنیا ہی میں اہل دنیا کو وبال جان ہے۔ ہر وقت ایک پریشانی میں مبتلا ہیں کوئی لڑکا مر نہ جاوے کوئی بیمار نہ ہوجائے۔ مال کو کوئی چور نہ لے جائے۔ فلاں مجھ سے بڑھ نہ جائے، لباس ہمارا ایسا ہو خوراک اس قسم کی ہو۔ غرض شب و روز اسی دھن اور خیالات میں گذر جاتے ہیں اور عمریں ختم ہوجاتی ہیں اور اہل اللہ کو وہ دولت حاصل ہے کہ جس کی نسبت وہ

---

(۱) زنجیروں اور قیدوں (۲) اے نعمتوں میں پڑے ہوئے لوگو (۳) عنقریب جب غبار چھٹ جائیگا تو تم کو معلوم ہوگا کہ تمہارے پیروں کے نیچے گھوڑا ہے کہ گدھا (۴) سورۃ التوبہ آیت ۵۵۔ سو ان کے اموال اور اولاد آپ کو تعجب میں نہ ڈالیں اللہ کو صرف یہ منظور ہے کہ ان چیزوں کیوجہ سے دنیاوی زندگی میں ان کو گرفتار عذاب رکھے۔

کہتے ہیں، کہ اگر سلاطین کو ہماری دولت کی خبر ہوجائے تو تلواریں کھینچ کر ہم پر چڑھ آویں۔ حضرت غوثؒ کی خانقاہ کے لیے پادشاہ سنجر نے چاہا تھا کہ کوئی گاؤں وقف کردے حضرت نے اس درخواست کے جواب میں لکھا۔

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد
در دل بود اگر ہوس ملک سنجرم

(اگر میرے دل میں ملک سنجر کی ہوس ہو تو خدا کرے کہ میرا نصیب سنجر کی چھتری کی طرح سیاہ ہوجائے)

زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب
من ملک نیمروز بیک جو نمی خرم

(جب سے کہ مجھے آدھی رات کی برکتوں کا علم ہوا ہے، ملک نیمروز کو ایک جو کے بدلے بھی خریدنے کو تیار نہیں ہوں)

یہ وہ ملک ہے

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بخاقانی
کہ یکدم باخدا بودن بہ از ملک سلیمان

(خاقانی کو تیس سال بعد یہ بات ثابت ہوئی کہ ایک لحہ خدا کے ساتھ ہونا، ملک سلیمان سے بہتر ہے)

یہاں شبہ ہوتا ہے کہ کیا ہم سلیمان علیہ السلام سے بڑھ جائیں گے؟ جواب یہ ہے، کہ مراد یہ ہے کہ ملک سلیمانی کہ باماشد یعنی ملک سلیمان اگر ہم کو مل جاوے تو وہ کچھ نہیں، اب شبہ تفضیل کا سلیمان علیہ السلام پر جاتا رہا۔

اہل اللہ اور اہل دنیا کی ترقی میں فرق

ان کو اس سلطنت کی اطلاع نہیں ہے، حجاب[1] میں پڑے ہوئے ہیں، اور یہ ان حضرات کو کہتے ہیں کہ بچارے ترقی سے محروم ہیں ان کو رفتار زمانہ کی خبر نہیں۔ پست خیال ہیں، جی ہاں! آپ بلند خیال ہیں۔ یاد رکھو جس قدر اوپر چڑھو گے اسی قدر نیچے گرو گے، قطب کی لاٹھ[2] سے گرو گے اور زیادہ چوٹ کھاؤ گے وہ تو ان کو تنزل[3] میں اور اپنے کو ترقی میں سمجھ رہے ہیں، اور وہ ان کو کھلی آنکھوں نظر حقیقت سے دیکھ رہے ہیں کہ یہی نیچے کو جا رہے ہیں۔ ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص منارہ پر چڑھ رہا ہو اور کوئی شخص آئینہ لے کر دیکھے تو اس کو منارہ الٹا نظر آئے گا اور یہ معلوم ہوگا کہ یہ شخص منارہ سے نیچے کو اتر رہا ہے۔ ایسے ہی لوگ اہل اللہ کو دیکھتے ہیں کہ وہ در حقیقت اوپر کو جا رہے ہیں مگر ان کی آنکھ پر چونکہ غلط بیں عینک[4] لگی ہوئی ہے اس لیے یہ ان کو اترتا ہوا دیکھتے ہیں جس کو یہ لوگ ترقی یافتہ سمجھتے ہیں۔ اہل اللہ اس کو پستی میں جاتا ہوا دیکھتے ہیں جو کنوئیں میں گر رہا ہے، یہ اس کو اوپر کو جاتا ہوا دیکھتے ہیں اس لیے کہ نظر حقیقت میں نہیں ہے، اور ہونا مشکل ہے اس لیے کہ جس مینڈک نے اول سے چہ بچہ[5] میں پرورش پائی ہو وہ سمندر کو کیا جانے گا، یہ تو ہمیشہ سے دنیا کے جھگڑے اور کیچڑ میں پھنس رہے ہیں دین کی ماء معین[6] کی ان کو کیا خبر ہے جو ہمیشہ پریشانی ہی میں رہا ہو جس کی عمر ہمیشہ ظلمت ہی میں گذری ہو، اس کو جمعیت اور نور کی حقیقت سے کیسے آگاہی ہو۔

تو نہ دیدی گر سلیماں را　　　چہ شناسی زباں مرغاں را!

---

(۱) پردے میں (۲) اونچا مینار (۳) پستی میں (۴) چشمہ لگا ہوا ہے (۵) گندے پانی کی حوضی (۶) زمین سے صاف پانی

(اگر تو نے سلیمان علیہ السلام کو نہیں دیکھا تو پرندوں کی زبان تو کیا سمجھ سکے گا)

غرض وہ ان کو تنزل[1] میں دیکھتے ہیں اور یہ ان کی حقیقت نظر آرہی ہے اس لیے بادشاہوں پر ان کو رحم آتا ہے کہ یہ بچارے کس خرافات[2] میں پڑے ہیں، اور اصلی دولت سے بے خبر ہیں، اور وہ ان کو پست خیال بتلاتے ہیں۔ غرض جبکہ قلبی[3] دولت ایسی شے[4] ہے تو اس میں تھوڑی سی کمی بھی اگر یہ حضرات دیکھتے ہیں، تو ان کی جان تک نوبت[5] پہنچ جاتی ہے چہ جائیکہ بڑی کمی ہو، وہ تو بہت ہی فکر کی بات ہے۔ اور جس بات سے وہ کمی پیدا ہوتی ہو وہ بہت احتراز[6] کے قابل ہے پس سماع میں یہ ضرر ظاہر ہے۔

سماع میں دلی یکسوئی ہونے کی وجہ

بعض دفعہ یہ دھوکا ہوتا ہے کہ سماع سے ہم کو جمعیت قلب ہوتی ہے۔ میں بتلاتا ہوں کہ وہ جمعیت کیسی ہوتی ہے۔ جناب من[7] وہ جمعیت ایسی ہوتی ہے جیسے شطرنج باز[8] کو شطرنج میں ہوتی ہے کہ بجز شطرنج کے کسی شئے[9] میں دل نہیں لگتا۔ شطرنج ہی میں سب خیالات آکر جمع ہوجاتے ہیں، اسی طرح صاحب سماع[10] کو گانے میں جمعیت ہوتی ہے کہ تمام تر توجہ ان کی اس میں مصروف ہوتی ہے اس کو وہ جمعیت سمجھتے ہیں۔ جمعیت مطلوبہ تو وہ ہے کہ ذکر اللہ میں جمعیت ہو غرض اس سے بھی کان کو روکنا چاہیے۔ یہ معنی ہیں گوش بند[11] کے اور لب بند[12] کے بھی یہی معنی ہیں کہ معاصی اور فضولیات سے لب[13] بند

---

(۱) پستی میں (۲) بے ہودہ باتوں میں (۳) دل کی دولت (۴) چیز ہے (۵) ان کی جان نکلنے لگتی ہے (۶) بچنے (۷) میرے آقا (۸) شطرنج کھیلنے والے کو (۹) سوائے شطرنج کسی چیز میں دل نہیں لگتا (۱۰) سماع سننے والے کو (۱۱) کان بند (۱۲) ہونٹ بند (۱۳) گناہ اور فضول باتوں سے ہونٹ بند رکھو

کرو، یہ معنی ہیں مولانا کے اس شعر کے حبس دم اس کا مدلول[۱] نہیں، اس لیے کہ حبس دم کوئی ایسی شئے نہیں کہ ایسی جلیل القدر کتاب میں اس کا ذکر کرتے۔ مثنوی شریف اس رتبہ کی کتاب ہے کہ جس کی نسبت مولانا جامیؒ فرماتے ہیں۔

مثنوی مولوی معنوی　　　ہست قرآں در زبان پہلوی

لیکن اس کا نفع اسی شخص کے لیے ہے جس کا فہم سلیم ہو؛ ورنہ یہ کتاب مومن سے کافر بنادینے والی ہے اور اگر فہم[۲] درست ہو تو کافر سے مومن بنادینے والی بھی یہی ہے؛ لوگ برا کرتے ہیں کہ جس کو دیکھو مثنوی لیے بیٹھا ہے ہر شخص کو یہ مفید نہیں ہے۔ غرض مولانا کی تعلیم کے یہ معنی نہیں ہیں۔ معنی یہ ہیں جو میں نے عرض کیے۔

خلوت کے فائدے

حاصل یہ ہے کہ خلوت میں اسباب مشوش قلب[۳] جب کم ہوں گے تو حضور قلب میسر[۴] ہوگا، قلب کا انجلا[۵] ہوگا خدا تعالیٰ کی معرفت اور خشیت پیدا ہوگی۔ نور حق سے مولانا کے شعر میں یہی مراد ہے، اور یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی روشنی لالٹین کی نظر آنے لگے گی؛ نور کے معنی اصل میں ظاہر بنفسہ اور مظہر لغیرہ[۶] ہیں، پس نور سے مراد قوت ادراکیہ[۷] ہے چنانچہ اس کا خاصہ ہے کہ اس سے حقائق کما حقہ ہی کا قلب کو ادراک[۸] ہوتا ہے اور خود اس کا ظاہر ہونا ظاہر ہی ہے۔ غرض یہ فائدہ ہے خلوت میں، کہ خلوت[۹] مجاہدات کی معین

(۱) سانس روکنے کو بیان کرنا مقصود نہیں (جو صوفیا کی ایک اصطلاح ہے) (۲) سمجھ (۳) دل کو پریشان کرنے والے اسباب تنہائی میں جب کم ہوں گے (۴) تب دل حاضر ہوگا (۵) اور دل صاف ہوگا (۶) جو خود ظاہر ہو اور دوسرے کو ظاہر کرنے والا ہو (۷) ایسی قوت حاصل ہو؛ جس سے حقائق منکشف ہوں (۸) حقیقتوں کو جیسا ان کے سمجھنے کا حق ہے آدمی سمجھ جاتا ہے (۹) تنہائی

ہے۔ اس تمام تر تقریر سے خلوت کا درجہ اور فضل[1] معلوم ہوا کہ وہ معین مقصود ہے خود فی نفسہ عبادت نہیں ہے۔ اس کا درجہ معلوم ہونے سے دو قسم کی غلطیاں رفع ہوتی ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ بعض تو ان میں تفریط[2] کرتے ہیں کہ اس کا قصد[3] ہی نہیں کرتے ہیں، وہ بھی غلطی میں ہیں کہ اس کے منافع[4] سے محروم ہیں اور بعض افراط[5] اور غلو کرتے، کہ اس کو مقصود سمجھتے ہیں اور ہر وقت خلوت ہی میں رہتے ہیں، جو چیزیں ان پر واجب یا مستحب ہیں ان کو بھی ادا نہیں کرتے۔ جنازہ کی نماز میں شریک نہیں ہوتے، کسی کو نفع نہیں پہنچاتے۔ اگر کوئی مسئلہ پوچھنے آتا ہے ٹال دیتے ہیں۔ اور بعضے اس قدر غلو کرتے ہیں کہ گناہ کا ارتکاب بھی ان سے ہو جاتا ہے۔

جاہل پیروں کی حکایت

کوئی جاہل درویش کسی مسجد میں مراقب تھے۔ ایک مسافر کی کمبختی آئی، بچارا مارا تھکا آکر وہاں سو رہا۔ خراٹے کی آواز سے بزرگ صاحب کے مراقبہ اور جمعیت[6] میں فرق پڑا، اس کو اٹھایا کہ جاگو ہمارے مراقبہ میں فرق آتا ہے، وہ غریب بیٹھا تھکا ہوا بہت تھا، پھر سو رہا اور خراٹے لینے لگا، پھر آئے پھر اٹھایا کہ ہماری نماز میں فرق آتا ہے۔ وہ پھر سو رہا۔ اس کے بعد پھر ان بزرگ سے نہ رہا گیا، چھرے سے آکر اس کا کام تمام کردیا۔ اور خوب جی لگا کر عبادت میں مشغول ہوگئے، صبح کو نمازی آئے دیکھا تو تمام مسجد میں خون بہ رہا ہے۔ پوچھا کہ کس نے مارا۔ میاں صاحب نے فرمایا کہ ہم نے مارا، ہماری نماز میں خلل ڈالتا تھا۔ خدا بچاوے ایسی جمعیت سے۔

(۱) بڑائی (۲) کمی (۳) ارادہ (۴) فائدے (۵) زیادتی (۶) یکسوئی

ایک اور ایسے ہی کسی صاحب کا قصہ ہے: کہ جنگل میں خلوت نشین تھا کسی نے پوچھا کہ آپ کو یہاں ڈر نہیں لگتا۔ کہنے لگے ڈر کاہے کا ہے۔ اس نے کہا کہ یہاں بھیڑئے شیر وشیرہ ہیں۔ کہنے لگے میں مخلوق سے کیا ڈرتا میں خدا سے تو ڈرتا ہی نہیں (توبہ توبہ) ایسی خلوت اور جمعیت قلب کسی کام کی ہے۔

خلوت کا درجہ

غرض یہ کہ خلوت کے اندر غلو ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس کا درجہ بیان کر دیا جائے۔ پس یاد رکھو کہ یہ مقدمہ مقصود ہے خود مقصود نہیں جیسے آگبوٹ[1] میں بیٹھ کر مکہ معظمہ جاتے ہیں تو آگبوٹ کا سفر عبادت نہیں، ہاں وسیلہ عبادت ہے۔ پس وسیلہ اور مقدمہ کو مقصود نہ سمجھنا چاہیے۔ مثلاً جب آگبوٹ جدہ پہنچے اور کہا جائے کہ اترو تو انکار کرے کہ نہ صاحب میں تو اترتا نہیں اس میں بیٹھنے سے تو مکہ مکرمہ پہنچتے ہیں تو عبادت ہے تم تو اتارتے ہو اس کو یہی کہا جاوے گا کہ ارے ظالم یہ تو سن لیا لیکن یہ بھی تو نے سنا کہ وسیلہ[2] اور مقدمہ سے قدر ضرورت کام لیا جاتا ہے ورنہ وہی مقصود ہو جاتا ہے۔ یہی نا تمام علم، نیم ملا خطرۂ ایمان کا مصداق ہے۔ جیسے عالمگیر کے وقت میں ایک فاحشہ عورت تھی اس نے کئی شوہر کر رکھے تھے اور ایک کی دوسرے کو خبر نہ تھی۔ کسی نے عالمگیر کو خبر کردی، عالمگیر نے اس کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا، وہ بہت گھبرائی اور کسی آزاد طالب علم سے پوچھا کہ مولوی صاحب کوئی حیلہ بتلاؤ، کہا کچھ دلواؤ تو بتلائیں، چنانچہ کچھ روپیہ ٹھہرا۔ کہا یوں کہیو کہ ایک مولوی صاحب وعظ فرما رہے تھے کہ لوگ ناحق زنا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے تو چار چار نکاح حلال کیے ہیں۔ ارے کمبختو!

---

(۱) بحری جہاز (۲) ذریعہ

جب ایک چھوڑ چار چار جائز ہیں تو کیوں زنا کرتے ہو۔ حضرت جی یہ مسئلہ میں نے سنا تھا اس لیے مجھے جراءت ہوئی۔ عالمگیر نے کہا یہ تو تو نے سنا لیکن یہ بھی سنا کس کو جائز ہیں۔ اری بے حیا، مرد کو چار نکاح جائز ہیں ایسے ہی ان حضرت نے یہ تو سن لیا کہ آگبوٹ میں سوار ہونا عبادت ہے لیکن یہ تحقیق نہ کیا کہ عبادت مقصودہ[1] ہے یا غیر مقصودہ[2]۔

جلوت کا فائدہ

اسی طرح خلوت بھی مقدمہ اور وسیلہ ہے عبادت کا، بعض لوگ خلوت کو جلوت پر ترجیح دیتے ہیں، مولانا رومیؒ نے اس کی نسبت عجیب بات لکھی ہے وہ فرماتے ہیں اے عزیز تو خلوت[3] کو جلوت[4] پر مطلقاً ترجیح دیتا ہے یہ تیری ناشکری ہے، اس لیے یہ فضیلتیں خلوت کی تجھ کو جلوت ہی کی بدولت تو معلوم ہوئی ہیں اور صحبت ہی کی وجہ سے خلوت کے برکات معلوم ہوئے ہیں اور اگر تمام عمر خلوت ہی میں رہتا تو خلوت کی حقیقت اور اس کے فضائل اور نیز دیگر تمام کمالات سے محروم رہتا، آج تو اس جلوت کو مٹا رہا ہے اور خلوت کو اس پر فضیلت دیتا ہے تیری ایسی ہی مثال ہے۔ ع

یکے بر سر شاخ و بن می برید

(ایک شخص شاخ پر بیٹھا ہوا تھا اور اسی کی جڑ کاٹ رہا تھا) واللہ بڑی لاجواب بات یہ ہے، حقیقت میں معقول اور یہ ہے فلسفہ سبحان اللہ، کیا سمجھے ہیں اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ اصل مقصود جلوت ہے اس لیے کہ انسان مدنی الطبع[5] ہے اس کی

---

(۱) اپنی ذات کے اعتبار سے عبادت (۲) اپنی ذات کے اعتبار سے عبادت بلکہ عبادت کے حصول کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے عبادت ہو اس کو عبادت غیر مقصودہ کہتے ہیں (۳) تنہائی (۴) ملے جلے رہنے (۵) انسان کی طبیعت میں تمدن ہے

طبیعت کا اقتضاء[1] ہے کہ اپنی بنی نوع سے مل کر رہے۔ یہ فطری اور فلسفی دلیل ہے اور شرعی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو عبادتیں ہمارے لیے مقرر فرمائی ہیں ان میں سے اکثر میں اجتماع کی ضرورت ہے، دیکھو نماز کہ جو بہت بڑی عبادت ہے، اس کی نسبت ارشاد ہے واركعوا مع الراكعين[2]۔ اور حدیثوں میں حلق ذکر کی بڑی فضیلت آئی ہے، ایسے مجمع میں ملائکہ نازل ہوتے ہیں، تقویت اسلام اور اعلاء کلمۃ اللہ کے جتنے اسباب ہیں وہ سب اجتماع ہی پر موقوف ہیں، حج ہے اس میں اجتماع کی ضرورت ہے اور حدیثوں میں صحبت نیک کی بہت فضیلت آئی ہے۔ غرض فطرت سے شریعت سے جلوت اور اجتماع کا مقصود ہونا معلوم ہوتا ہے، لیکن اس اجتماع اور جلوت کا معین خلوت ہے۔ اس اجتماع کی اہلیت خلوت ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

خلوت معین جلوت ہے

اس کو ایک مثال کے ضمن میں سمجھیے، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوجاوے گا کہ ہم کو اپنے دنیوی مقاصد میں بھی خلوت کی ضرورت معین ہونے کے درجہ میں ہے، وہ یہ ہے، کہ مثلاً ایک شخص ہے اس کے نقطہ خیال میں تحصیلداری مطلوب ہے اب دیکھیے اس کی غایت[3] کیا ہے، غایت اس کی یہ ہے ایک کمرہ میں بیٹھنا اور مقدمات فیصل کرنا، دیکھیے تحصیلداری ایک ایسا منصب ہوا جو اجتماع کو مقتضی ہے، لیکن اہلیت اس منصب کی خلوت ہی سے آوے گی، اس لیے کہ خلوت میں بیٹھ کر قانون یاد کرے گا۔ اور جن کتابوں میں امتحان ہوگا ان کو بیٹھ کر رٹے گا،

---

(۱) اس کی طبیعت کا تقاضا ہے کہ اپنے جیسے انسانوں میں مل کر رہے (۲) رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ (۳) غرض

پس یہ خلوت اس جلوت کے اہل بننے کے لیے ہوئی۔ اور جیسے طبیب جو مریض کو مسہل[1] دیتا ہے تو کہہ دیتا ہے کہ تنہا رہنا، باتیں کسی سے نہ کرنا اور یہ تصور کرنا کہ اب دست آتے ہیں۔ غایت اس کی یہ ہے کہ تندرست ہو کر پھر مل جل کر رہیں گے۔ لیکن وہ اس اجتماع کا اہل نہ رہا تھا اس لیے ضرورت ہو گئی خلوت کی۔ غرض خلوت کی ہر کام میں ضرورت ہے۔ آج اگر کوئی اہل تصوف پر اعتراض کرے کہ وہ خشک دماغ ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کو عقل نہیں۔ صاحبو طبیب نے جو تم کو ایک ادنیٰ اور خسیس[2] مقصود یعنی دست آنے کے لیے خلوت کی تعلیم کی تھی اس پر تو تم نے اعتراض نہ کیا اور جس کا مقصود اعلیٰ درجہ کا ہو کہ اس سے بڑھ کر کوئی مقصود نہیں اس پر اعتراض کرتے ہو، تف بریں عقل و دانش[3] جیسے طبیب نے دستوں کے لیے خلوت اور تصور دستوں کا بتلایا ہے ایسا ہی ان سالکین کو بھی ماسوی اللہ کے دفع کے واسطے مسہل دیا گیا ہے اور وہ اس تصور میں بیٹھے ہیں کہ اب محبوب جلوہ گر ہو اور اب جلوہ گر ہو۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی
شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(ذرا سی دیر کو اس بادشاہ سے غافل مت بیٹھ، شاید کہ وہ اس وقت تیری نگاہ کرے اور تو آگاہ نہیں)

یہ ہے درجہ خلوت کا کہ جس سے اس کی ضرورت ہو گئی اور یہ بھی ثابت ہوا کہ وہ لذاتہا مقصود[4] نہیں، لغیرہا ضروری ہے[5]۔

---

(۱) دستاور دوا (۲) گھٹیا مقصود (۳) ایسی عقل و سمجھ پر افسوس ہے (۴) اپنی ذات کے اعتبار سے مقصود نہیں (۵) اپنے غیر کے لیے ضروری ہے کہ اسی سے صلاحیت پیدا ہوتی ہے

اصحاب کہف کا قصہ

اس آیت میں اسی کا ذکر ہے، ارشاد ہے: وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ[1] الخ یہ قصہ اصحاب کہف کا ہے۔ میں مفصل قصہ کا نہ بیان کروں گا۔ قرآن مجید میں بقدر ضرورت ہی ہے۔ اکثر واعظین قصے ہی بیان کیا کرتے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کا مشرب تو موافق قرآن کے یہ ہے۔

ما قصہ سکندر ودارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر ووفا مپرس

(ہم نے دارا وسکندر کے قصے نہیں پڑھے ہیں ہم سے مہر ووفا کی داستان کے علاوہ اور کچھ نہ پوچھو)

اور چونکہ اس وقت جو مجھ کو مقصود ہے وہ پورے مجمل قصے پر بھی موقوف نہیں، اس لیے میں صرف اتنا قصہ بیان کروں گا جو فقط اس آیت کے حل کرنے کے لیے کافی ہو۔ بعض کو قصے ہی مقصود ہوا کرتے ہیں اور جو حقیقت شناس ہیں وہ اس سے گھبراتے ہیں، اصحاب کہف ایک مشہور جماعت کا لقب ہے، یہ سات آدمی تھے، ایک کافر بادشاہ کے زمانہ میں وہ بادشاہ بتوں کو سجدہ کرایا کرتا تھا، ان سات کو اللہ تعالیٰ نے خود بخود ہدایت کی اور توحید ان کے دل میں گھر کر گئی۔ اب ان کو پریشانی ہوئی کہ اگر ہم یہاں رہتے ہیں تو بادشاہ ہم سے شرک کرائے گا اور مقابلہ کریں تو کیسے کر سکتے ہیں، سات آدمی ایک سلطنت کا کس طرح مقابلہ کریں ایسی صورت میں آدمی اپنی جان اور ایمان مخفی[2] ہو جانے اور بھاگ جانے ہی سے بچا سکتا ہے، ہاں شاذ و نادر[3] اتفاق سے ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ کسی حکمت عملی

---

(۱) سورۃ الکہف آیت ۱۶۔ اور جب تم ان لوگوں سے الگ ہو گئے اور ان کے معبودوں سے بھی (۲) چھپنے (۳) کبھی کبھی

سے حق بھی ظاہر ہوجائے اور جان و ایمان بھی بچ جائے۔

ملادوپیازے کی ذکاوت

اکبر بادشاہ کے یہاں ایک مرتبہ بہت سے بددین جمع ہوگئے تھے۔ آپس میں صلاح ہوئی کہ ملادوپیازے کو زک پہنچانا چاہیے، بادشاہ نبی بنے اور کوئی ابوبکر کوئی عمر۔ اسی طرح ہر ایک نے ایک ایک صحابی کا نام لیا: کہ میں فلاں بنتا ہوں اور یہ فلاں بنتا ہے: ملادوپیازے کا نمبر آیا یہ حیران تھا کہ اگر کسی کا نام لیتے ہیں تو اس مجمع باطل کی شرکت ہوتی ہے اور اگر نہیں لیتے اور اس مجمع پر انکار کریں تو بادشاہ کی مخالفت ہوتی ہے۔ لیکن ایک بات سوجھ گئی، کہنے لگے میں تمہارا ابوجہل ہوں گا اور تم سب پر لعنت کیا کروں گا۔ کیا خوبصورتی سے اپنا ایمان اور جان بچائی، لیکن ہر جگہ تو ملادوپیازے جیسے ذہین ہوتے نہیں، اور نہ ہر وقت ایسی باتیں چل سکتی ہیں۔

اصحاب کہف کے غار میں چھپنے کی وجہ

اس لیے ان حضرات نے اسی میں سلامتی سمجھی کہ سب سے خفیہ طور سے رہو، چنانچہ چند روز تک مخفی طور سے رہے۔ ایک مرتبہ مشورہ کیا کہ کیوں کب تک رہیں گے اگر کسی دن ظاہر ہوگئے تو پھر آفت آوے گی اور نیز یہاں اگر اسی طرح رہتے رہے تو ان کی صحبت کا اثر نہ ہم پر ہوجاوے اس لیے کہیں ایسی جگہ چلدو کہ ان کو ہماری متعلق خبر نہ ہو۔ چنانچہ مشورہ کرکے وہ ایک غار میں جاچھپے اور ان کے ہمراہ ایک کتا بھی چلا گیا اور وہاں ان پر اللہ تعالیٰ نے نوم مسلط[1] کردی۔ چنانچہ

(۱) چند طاری کردی

تین سو برس[1] سوتے رہے، اس کے بعد آنکھ کھلی۔ آگے پورا قصہ ان کا اس سورۃ میں ہے عجیب قصہ ہے مجھ کو اتنا ہی بیان کرنا تھا۔ غرض اس مقام کی یہ آیت ہے۔ اس آیت میں ان کے مشورہ کا ذکر ہے۔

ترجمہ و تفسیر آیت

ترجمہ اس آیت کا یہ ہے (کہ جب تم نے علیحدہ ہوگئے اور ان کے معبودوں سے سوا اللہ کے) "الا اللّٰہ" میں دو احتمال ہیں، اول تو یہ کہ یا تو اس میں "یعبدون" حال ہے اس وقت تو یہ معنی ہوں گے کہ تم لوگ ان کفار سے اور جن کی وہ سوائے اللہ کے عبادت کیا کرتے تھے، ان سے علیحدہ ہوگئے لیکن اس توجیہ پر ان کا تعلق خدا تعالیٰ کے ساتھ اس کلام سے معلوم نہیں ہوا۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ "الاالله" "اعتزلتمواھم" کا معمول ہو یعنی جب کہ تم لوگ ان سے علیحدہ ہوگئے مگر اللہ سے کہ اس سے علیحدہ نہیں ہوئے اس صورت میں استثناء منقطع ہوگا اور "الاالله" کی یہ تقدیر ہوگی "لکن اللّٰہ فلم تعتزلوہ فاوٗو" (الکھف)۔ یعنی جب ان سے علیحدہ ہوگئے تو اب غار کی طرف چلو نتیجہ اس کا کیا ہوگا "ینشرلکم ربکم من رحمة" یعنی نتیجہ یہ ہے کہ تمہارے لیے تمہارا رب اپنی رحمت کا حصہ پھیلائیں گے۔

یہ لوگ کیسے مودب تھے کہ ان کو حالانکہ نہ شرائع[2] معلوم نہ کسی سے تعلیم پائی تھی نہ کسی کے صحبت یافتہ تھے لیکن مؤدب اس درجہ کہ "واذاعتزلتموا ھم الخ" سے وہم ہوتا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ کو بھی چھوڑ دیا ہو اس لیے کہ یہ کلام اس طرح کا ہے جیسے ہمارے محاورہ میں کہا کرتے ہیں کہ میاں جب تم نے سب

---

(۱) تین سو سال (۲) نہ شریعتوں کا علم

معبودین کو چھوڑ دیا جس میں اللہ تعالیٰ بھی بظاہر داخل ہیں کیونکہ وہ سب ہی کے معبود ہیں۔ بت پرست بھی ان کی عبادت کے مدعی ہیں گو اگر "الا اللہ" نہ ہوتا تب بھی یہ معلوم تھا کہ ان سب کو اللہ ہی کے واسطے چھوڑا ہے تو پھر خدا کو کیسے چھوڑتے۔ لیکن تاہم کلام میں ادب ملحوظ رکھنے کے لیے "الااللہ" بڑھایا، اس سے ان کا اللہ تعالیٰ کا محب[1] ہونا اور نہایت مؤدب ہونا معلوم ہوتا ہے، اور دوسری عجیب بات یہ ہے کہ تعلیم تو کہیں پائی نہ تھی ان کے دل میں یہ کیسے آیا کہ دین کے بچانے کی ضرورت ہے۔ یہ نہایت درجہ ان کے متادب ہونے کو بتلا رہا ہے۔ تیسرے یہ کہ غار میں جانے کے ثمرات کو بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی رحمت نازل فرماویں گے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت لامتناہی ہے

اور حقیقت شناسی ملاحظہ کیجیے کہ یوں نہیں کہا **ینشرلکم ربکم رحمة** بلکہ "من" بڑھایا جس سے یہ مسئلہ مستفاد[2] ہوا کہ حق تعالیٰ کی رحمت غیر متناہی[3] ہے جس پر رحمت ہوگی کوئی حصہ اس کا ہوگا باقی صفت رحمت کا اس کی کیا ٹھکانا ہے اس قدر وسیع ہے کہ جس کی نہایت نہیں ہے، حضرت غوث اعظمؒ نے چالیس برس تک رحمت کا بیان کیا ایک روز قہر کا بیان فرمادیا تو کئی آدمی مر گئے، الہام ہوا کہ اے عبدالقادر کیا ہماری اتنی ہی رحمت تھی کہ چالیس برس میں اس کا بیان ختم ہوگیا۔ پس رحمت کی اور اسی طرح حق تعالیٰ کی ہر صفت کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

---

(۱) اللہ سے محبت رکھنا اور بہت با ادب ہونا معلوم ہوا (۲) یہ مسئلہ نکلتا ہے (۳) اللہ کی رحمت کی کوئی انتہا نہیں ہے

دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

(تیری تعریف میں تمام عمر ختم ہو گئی مگر ہم ابھی تیر تعریف کی ابتداء ہی میں پڑے ہوئے ہیں)

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہرچہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم

(اے خدا تو ہمارے خیال قیاس گمان اور وہم سب سے ہی برتر ہے اور اس تمام چیز سے بھی برتر ہے)

سعدی فرماتے ہیں۔

بحسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

(نہ تو اس کا حسن کو دم انتشار کہ سکتا ہے ور سعدی کا کلام بھی ابھی ختم نہیں ہوا یوں سمجھ لیجیے جیسے کہ استسقا کے مرض والا پیاسا مر رہا ہے اور دریا اسی طرح بہ رہا ہے)

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچیں بہار تو از داماں گلہ دارد[1]

(میری نگاہ کا دامن ہی تنگ ہے ورنہ تیرے حسن کے پھول تو بے تحاشہ ہیں، تیری ان بہاروں کی وسعت سے مجھے تنگ دامنی کی شکایت ہے)

---

(۱) میری نگاہ کا دامن ہی تنگ ہے ورنہ تیرے حسن کے پھول تو بے تحاشہ ہیں تیری ن بہاروں کی وسعت سے مجھے تنگ دامنی کی شکایت ہے

رحمت الٰہی انسان کو گھیرے ہوئے ہے

ہم بچارے کیا شے ہیں جو رحمت کا احاطہ کر سکیں، رحمت ہم کو خود محیط ہو رہی ہے، اس لیے ارشاد ہے الا انه بکل شیٔ محیط[1] جب احاطہ ذاتی ہے تو رحمت لازم ذات ہے اس لیے وہ بھی محیط ہوگی اور الا انه بکل شیٔ محیط سے بے حد عنایت ظاہر ہوتی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ محبوب اگر کہیں ملے تو دو حالتیں ہوا کرتی ہیں یا تو تم اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لو اور یا وہ تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے۔ دوسری صورت میں جس قدر لطف اور مزہ ہے پہلی صورت میں نہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

اگرچہ دور افتادم بایں امید خورسندم
کہ شاید دست من بار دگر جانان من گیرد

(اگرچہ اس نے مجھ کو دور جھٹک دیا ہے مگر میں اس امید پر خوش ہوں کہ شاید دوسری بار محبوب کا دامن پکڑ سکوں)

اگر تم محبوب کو اپنی گود میں بٹھلاؤ تو لطف اس میں بھی ہے لیکن اگر قسمت سے وہ تم کو اپنی آغوش میں لے لے تو اس کی برابر کہیں لطف نہیں، چنانچہ اہل محبت اس کو خوب سمجھ سکتے ہیں۔ پس حق تعالیٰ کو اول تو کوئی احاطہ نہیں کر سکتا اور اگر بفرض محال کوئی کر بھی سکتا تو محبت کا مقتضیٰ یہ تھا کہ تم اسی کی تمنا کرتے کہ وہ ہم کو اپنے احاطہ میں لیلے لیکن وہ بے مانگے ہی دیتے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے۔ الا انه بکل شیٔ محیط غرض حق تعالیٰ کی رحمت چونکہ بے انتہا ہے اس لیے رحمت پر "من" بڑھایا ایک ثمرہ تو غار میں جانے کا یہ ہوا کہ دوسرا یہ ہے وهیٔ لکم من امرکم مرفقاً ورود کردے گا تمہارے م

---

(۱) آگاہ ہو جاؤ بیشک وہ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے

دین میں کامیابی کا سامان۔ پس دو ثمرے بیان کیے ایک میں اشارہ مقصود کی طرف ہے اور دوسرے میں اس مقصود کے مقدمات کی طرف تفصیل اس کی یہ ہے کہ مقصود رحمت حق ہے جو فاوٗوا الی لکھف پر مرتب ہے لیکن یہ مقصود عادتاً اس پر بلا واسطہ مرتب نہ ہوگا، گو کلام میں بوجہ اہتمام شان اور بسبب اس کی مقصودیت کی اظہار کے، اس کو بلا فصل[۱] "فاوٗوا الی الکھف" کے بعد ذکر کردیا ہے لیکن صورت اس کے ترتب[۲] کی یہ ہوگی کہ کہف میں جانے کے بعد اسباب مہیا ہوں گے تکمیل دین کے اور بواسطہ اس کے رحمت کا ترتب ہوگا پس رحمت کا مقدمہ تکمیل دین کے اسباب کا مہیا ہونا ہے اور تکمیل دین کا مقدمہ کہف میں جانا ہے۔ پس کہف میں جانا مقدمہ کا مقدمہ ہے[۳]۔

نظم قرآنی میں اسلوب کلام کی رعایت ہے

اور یہ آیت شرح اور اعادہ ہے اس اجمال کا جو اول اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے یعنی اول حق تعالیٰ نے اجمالاً قصہ اصحاب کا بیان فرمادیا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

اذ اوی الفتیۃ الی الکھف فقالوا ربنا آتنا من لدنک رحمۃ وھیٔ لنا من امرنا رشدا فضربنا علی آذانھم فی الکھف سنین عددا ثم بعثناھم لنعلم ای الحزبین احصی لما لبثوا امدا[۴].

---

(۱) بغیر فصل کے (۲) اس حکم کے مرتب ہونے کی شکل یہ ہوگی (۳) گویا کہف میں جانا ہی اللہ کی رحمت کا ذریعہ ہے پہلے کیونکہ اس میں جاکر دین کی تکمیل ہوئی جو سبب بنا رحمت الٰہی کے متوجہ ہونے کا (۴) سورۃ الکھف آیت ۱۰، ۱۱، ۱۲۔ ترجمہ: وہ وقت قابل ذکر ہے جبکہ ان نوجوانوں نے اس غار میں جا کر پناہ لی پھر کہا کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنے پاس سے رحمت کا سامان عطا فرمائیے اور ہمارے لیے کام میں درستی کا سامان مہیا کردیجے۔ سو ہم نے اس غار میں ان کے کانوں پر سالہا سال تک نیند کا پردہ ڈال دیا پھر ہم نے ان کو اٹھایا تاکہ ہم معلوم کرلیں کہ ان دونوں گروہ میں کونسا گروہ ان کے رہنے کی مدت سے زیادہ واقف تھا (بیان القرآن ج ۶۔ ص ۱۰۸)۔

یہ قصہ ہے اجمالاً گویا متن ہے آگے نحن نقص علیک نباھم بالحق[۱]۔ سے اس کی شرح ہے متن کے اندر جو اصل مغز تھا قصہ کا وہ بیان فرمادیا، شرح میں اس کی تفصیل ہے۔ سبحان اللہ، کیا عجیب طرز ہے مصنفین کی عادت ہے کہ اول مختصراً بطور فہرست کے مقصود بیان کرتے ہیں، حق تعالیٰ نے اسالیب کی اپنے کلام پاک میں رعایت فرمائی ہے اور دوسرے مقامات میں بھی ایسے امور کی بہت رعایت ہے، دیکھیے خطیبوں اور واعظین کی عادت ہوتی ہے کہ اول خطبہ پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد مقصود شروع کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے بھی ایک مقام پر دلائل توحید سے پہلے خطبہ بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے۔ قل الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی[۲]۔ یہ ایک خطبہ ہے اس کے بعد مقصود یعنی بیان دلائل توحید شروع ہوا ہے اور یہاں متن کے موقعہ پر ایک دعا آئی ہے۔ ربنا آتنا من لدنک رحمۃ و ھیٔ لنا من امرنا رشداً[۳]۔ اس آیت میں جو کہ شرح کے موقع پر ہے۔ ینشرلکم ربکم من رحمۃ[۴] سے اس کی طرف اشارہ ہے یہاں اضافت کی وجہ سے رحمت کی تنکیر[۵] نہ ہوسکتی تھی، اس لیے یہاں "من" بڑھادیا، اور متن کے موقع پر من لدنک کی وجہ سے تعریف کی ضرورت نہ تھی اس لیے رحمۃ کو منکر[۶] لائے جو تنکیر کے سبب مترادف ہے من رحمۃ کا متن میں جس رحمت کی درخواست کی تھی شرح میں بھی اس کی امید کو ایواء الی الکھف کا ثمرہ کرکے ظاہر کیا ہے، گویا حاصل یہ ہے، کہ اے اللہ! جس

---

(۱) الکھف آیت ۱۳۔ ہم ان کا واقعہ آپ سے ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہیں (۲) کہہ دو تمام تعریف اللہ کے لیے ہے اور سلام ہے اس کے برگزیدہ بندوں پر (۳) اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنے پاس سے رحمت کا سامان عطا فرما اور ہمارے لیے کام میں درستی کا سامان مہیا فرما (۴) تم پر تمہارا رب اپنی رحمت پھیلا دیگا (۵) معناف ہونے کی وجہ سے رحمت کو نکرہ نہیں لاسکتے تھے (۶) نکرہ ذکر کیا

رحمت کا ہم نے آپ سے سوال کیا تھا وہ ہم کو عنایت فرمائیے سبحان اللہ کلام میں کیا تناسق ہے۔

عمل کرے لیکن اپنے عمل پر نظر نہ رکھے

اور فاوٗا الی الکھف ینشرلکم ربکم الخ میں ایک مسئلہ لطیف کی طرف اشارہ ہے وہ یہ ہے کہ اعمال کو گو ثمرات[1] میں دخل ہے لیکن بدون مشیت حق کے ان کا ترتب[2] ضروری نہیں ہے، بعض مرتبہ بڑی بڑی محنتیں کرتے ہیں اور ثمرہ کچھ مرتب نہیں ہوتا اس لیے ہر حالت میں یہ ضروری ہے کہ حق تعالیٰ پر نظر رکھے، عمل کرے اور عمل پر نظر نہ ہو، مولانا فرماتے ہیں۔

ایں ہمہ گفتیم لیک اندر بسیچ
بے عنایات خدا ہیچم و ہیچ

(ہم نے یہ سب کچھ کہدیا ہے مگر ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ خدا کی عنایات کے بغیر ہم کچھ نہیں ہیں)

بے عنایات حق و خاصان خدا　　　گر ملک باشد سیہ ہستیش ورق

(بغیر اللہ تعالیٰ کے عنایت اور خاصان خدا کی توجہ کے اگر فرشتہ بھی ہو تو اس کی ہستی ایک سادہ ورق کی طرح ہے)

اسی واسطے اصحاب کہف غار میں جا پہنچے تو مطمئن نہیں ہوئے، ناز نہیں ہوا، غار میں آجانے سے یہ نہیں سمجھے کہ اب ہم مامون ہوگئے بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے منتظر رہے اپنی تدبیر پر وثوق نہیں کیا، اسی واسطے مولانا تدبیریں بتلاتے ہیں

---

(۱) نتائج کے مرتب ہونے میں اگرچہ دخل ہے (۲) لیکن بغیر اللہ کے چاہے اس پر نتیجہ مرتب ہونا ضروری نہیں

مگر پھر منتظر ہو کر خدا تعالیٰ کی طرف التجا ظاہر فرماتے ہیں۔

صد ہزاراں دام ودانہ است اے خدا   ما چو مرغان حریص بے نوا

(اس دنیا میں سیکڑوں جال اور دانے (ترغیبات) پھیلے ہوئے ہیں اور ہماری حیثیت لالچی پرندوں کی طرح ہے)

دم بدم پابستۂ دام نوایم   گر ہمہ شہباز و سیمرغے شویم

(ہم چاہے کتنے ہی شہباز اور سیمرغ سے بلند ہمت کیوں نہ ہوجائیں مگر پھر بھی قدم قدم پر نئے جالوں میں پھنس جاتے ہیں)

مے رہائی ہر دمے ما را و باز   سوئے دامے میرویم اے بے نیاز

(تو ہر دم ہم کو رہا کرتا ہے اور ہم پھر دوسرے جال کی طرف چلے جاتے ہیں)

ہماری یہی حالت ہے کہ ایک جال سے بچتے ہیں دوسرے جال میں پھنستے ہیں۔ ہم پھنستے ہیں وہ نکالتے ہیں۔ میں خود اپنی حالت کہتا ہوں کہ ایک بلا سے بچتا ہوں دوسری میں مبتلا ہوتا ہوں حسب حال یہ شعر یاد آتا ہے۔

چہل سال عمر عزیزت گذشت   مزاج تو از حال طفلی نہ گشت

(تیری عمر عزیز کے چالیس سال گذر گئے مگر تیرا مزاج لڑکپن کے حال سے نہیں بدلا)

پچاس کا ایک شعر ہے۔

ایکہ پنجاہ رفت در خوابی   مگر ایں پنج روز دریابی

(اے کہ تیرے پچاس سال سوتے سوتے گذر گئے شاید یہ دو پانچ روز باقی رہ گئے ہیں اس میں تو حقیقت کو پالے)

اور ساٹھ کی نسبت کسی نے کہا ہے۔ ع

چو شصت آمد نشست آمد بدیوار

(جب ساٹھ سال کی عمر ہوگئی تو دیوار سے سہارا لگانے کی ضرورت آجاتی ہے)

اصلاح نہ ہوئی تو تمام عمر خرافات ہی میں گذر گئی لیکن اس سے دل شکستہ نہ ہو اس لیے کہ دل شکستہ ہونے کا انجام یہ ہے کہ آدمی کام سے بیٹھ جاتا ہے۔ ہمارا کام یہی ہے کہ چلیں اور گریں، ان کا کام یہ ہے کہ ہم کو اٹھائیں انشاء اللہ انجام بخیر ہوگا۔ بندہ کا کام سعی کا ہے۔

اندریں رہ می تراش و می خراش　　تا دمے آخر دمے فارغ مباش

(اپنے نفس کو درست کرتا رہ اور آخری وقت تک بھی غافل مت بیٹھ)

یہ فکر نہ کرو کہ بے فکر ہو کر رہیں، یہ نفس کا کید[1] ہے، نفس یوں چاہتا ہے کہ آرام سے رہوں نفس کو کشاکشی[2] سے تکلیف ہوتی ہے وہ کبھی غالب ہوتا ہے کبھی ہم اس غالب ہوتے ہیں، وہ چاہتا ہے کہ میں چین سے بیٹھ جاؤں، مصیبت سے چھوٹ جاؤں اس لیے فارغ ہونے کی فکر نہ کرو۔ آگے مولانا فرماتے ہیں۔

تا دمے آخر دمے آخر بود　　کہ عنایت با تو صاحب سر بود

(آخر دم تک کوئی لمحہ ایسا آئے گا کہ تیرے اوپر اللہ کی عنایت نازل ہو جائیگی)

یعنی آخر کوئی وقت تو ایسا آوے گا کہ عنایت حق تجھ کو کھینچ لے گی اور اگر اس بات کا فکر ہے کہ افسوس بزرگ تو نہ ہوئے تو مارو جھاڑو[3] کیسی بزرگی اس کوچہ میں تو مٹنا[4] ہے۔ بعض لوگ اسی واسطے ذکر و شغل کرتے ہیں کہ بزرگ بن جاویں، یاد رکھو یہ شرک فی الطریقت[5] ہے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت کوئی عمل ایسا بتلایئے جس سے حضور ﷺ کی زیارت ہو۔ حضرت نے فرمایا کہ بھائی تمہارا بڑا حوصلہ ہے کہ جو اس کی تمنا کرتے ہو، ہمارا

---

(۱) نفس کا مکر ہے (۲) کھینچا تانی (۳) اس بات کو چھوڑ دو (۴) تصوف کی گلی میں اصل چیز اپنے کو مٹانا ہے (۵) طریقت میں اس کو شرک سے تعبیر کرتے ہیں۔

تو ذہن بھی کبھی اس طرف نہیں جاتا۔ ہم کو تو واللہ اگر حضور ﷺ کے روضۂ اقدس کے گنبد خضرا ہی کی زیارت ہوجائے تو غنیمت ہے۔ بزرگی اور تقدس کی نیت چھوڑو ہم تو کہتے ہیں کہ اگر اللہ میاں ناراض نہ ہوں تو یہی غنیمت ہے، محبت تو وہ شے ہے کہ محبوب کا مرتبہ تو بہت زیادہ ہے۔ محبوب کے یہاں کا کوئی ادنیٰ آدمی اگر جوتیاں بھی مارے تو اس کو بھی فخر سمجھے

حکایت

میں نے ایک حکایت سلاطین ترکیہ میں سے کسی سلطان کی سنی ہے، کہ قسطنطنیہ میں وزیر اعظم کی سواری جارہی تھی اور حسب دستور ہمراہ ایک آدمی ہٹو بچو کا غل مچاتا ہوا آگے آگے جاتا تھا۔ ایک عرب کو ذرا ہٹنے میں دیر ہوئی اس وزیر نے ایک ہنٹر رسید کیا۔ اس عرب کو غصہ آیا اس نے منہ پر ایک جوتہ کھینچ کر مارا۔ گرفتار کر لیے گئے اور یہ مقدمہ سلطان المعظم کے اجلاس میں پیش کیا۔ سلطان نے فرمایا کہ واقعی انہوں نے بڑا جرم کیا۔ لیکن میں اطلاع کیے دیتا ہوں کہ اگر میرے ساتھ یہ واقعہ ہوتا تو میں ان کا جوتہ سر پر رکھ لیتا اس لیے کہ دار محبوب یعنی مکہ مکرمہ کے رہنے والے ہیں۔

محبت اپنے کو مٹانے کا نام ہے

تو صاحبو! یہ ہوس ہی چھوڑ دو کہ ہماری شان ہوگی ارے محبت اور جاہ تو متضاد ہیں[1]، محبت جلنے اور گھلنے اور مٹنے کے لیے۔

افروختن و سوختن و جامہ دریدن　　　پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

---

(۱) ایک دوسرے کی ضد ہیں

(پروانہ نے جلنا۔ شمع نے بھڑکنا اور پھول نے کپڑے پھاڑنا مجھ سے ہی سیکھا ہے)

عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن　　　دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

(عاشقی کیا ہے کہو محبوب کا غلام ہوجانا۔ اور دوسرے کے ہاتھ میں دل دیکر حیران ہوجانا)

سوئے زلفش نظرے کردن درویش دیدن　　　گاہ کافر شدن و گاہ مسلماں بودن

(کبھی اسے اس کے زلف کی طرف نظر کرنا اور کبھی اس کے چہرے کو دیکھا گویا کبھی کافر ہوجانا اور کبھی مسلمان ہوجانا)

کفر اور اسلام یہ اصطلاحی الفاظ ہیں ان سے فنا اور بقا مراد ہے پس یہاں ہر دم فنا و بقا ہے۔ حضرت احمد جان فرماتے ہیں۔

کشتگان خنجر تسلیم را　　　ہر زماں از غیب جان دیگر است

(جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا کے شہید ہیں ان کو غیب سے ہر وقت ایک نئی روح ملتی رہتی ہے)

پس ترا ہر لحظہ مرگ و رجعتے است　　　مصطفیٰ ﷺ فرمود دنیا ساعتے است

(پس تو ہر لحہ موت و حیات کے مزے چکھتا رہتا ہے محمد ﷺ نے فرمایا کہ دنیا ایک ساعت کے برابر ہے)

اگر اس فنا و بقا کا تماشہ منکشف[1] ہوجائے تو آدمی بھول جائے دعویٰ اور پندار[2] کو، اور اس کا دعویٰ اور پندار ایسا ہی ہے جیسے ایک قطرہ بارش کا ابر[3] سے جس وقت جدا ہوا تو کہتا تھا انا کذا و انا کذا[4] لیکن جس وقت دریا میں پہنچا تو اس وقت اس کو اپنی ہستی کی حقیقت معلوم ہوئی۔ شیخ شیرازیؒ اسی مضمون کو

---

(۱) اگر اس کے مٹنے اور باقی رہنے کی حقیقت کھل جائے (۲) اپنی ہستی اور اس کے دعویٰ کو بھول جائے (۳) بادل سے (۴) میں ایسا ہوں اور ویسا ہوں

فرماتے ہیں۔

یکے قطرہ از ابر نیساں چکید　　خجل شد چو پہنائے دریا بدید

(ابر نیساں سے ایک قطرہ ٹپکا مگر جب اس نے دریا کی وسعت کو دیکھا تو بہت شرمندہ ہوا)

کہ جائے کہ دریاست من لیستم　　گر او ہست حقا کہ من نیستم

(جس جگہ کہ یہ دریا بہ رہا ہے میری کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور اگر ہستی دریا کا نام ہے تو میرا وجود عدم کے برابر ہے)

الحاصل اصحاب کہف کو اپنے عمل پر ناز نہیں ہوا بلکہ حق تعالیٰ پر نظر رہی اور اول جو دعا کی تھی ربنا آتنا من لدنک رحمة الخ اس کو یہاں بطور ثمرہ[1] دوسرے عنوان سے بیان کیا اور اس عنوان بدلنے میں بہت اسرار اور غوامض[2] ہوں گے جو غور کرنے سے سمجھ میں آسکتے ہیں لیکن میری عادت یہ ہے کہ جو بات بے تکلف سمجھ میں آجاتی ہے اس کو بیان کر دیتا ہوں اور جو نہیں سمجھ میں آتی اس کو چھوڑ دیتا ہوں یہ تمام تر تقریر اس آیت کی تفسیر و ترکیب اور بعض لطائف کے متعلق تھی۔

آیت سے نکلنے والے مسئلے

اب مقصود کو اس سے استنباط کرتا ہوں۔ جس کو تقریر سابق پر غور کرنے سے عاقل خود بھی سمجھ سکتا ہے لیکن تصریحاً بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ بس جاننا چاہیئے کہ اس آیت سے چند امور ثابت ہوئے۔

---

(۱) بطور نتیجہ (۲) نکات چھپے ہوئے ہیں

اول: تو "فاوٗا الی الکھف" سے یہ سمجھا گیا کہ کسی درجہ میں خلوت مقصود ہے۔

دوم: "فاوٗا کو اعتزلتموھم" پر مرتب کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ خلوت جب نافع ہے جب کہ جلوت سے مضرت[1] ہو۔

سوم: اشارہ اس طرف ہو کہ مسلم کی شان یہ ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو جب باطناً عزلت ہے تو ظاہراً بھی عزلت[2] ہونا چاہیے۔

چہارم: خلوت فی نفسہ مقصود[3] نہیں بلکہ رحمت حق مقصود ہے کما یدل علیہ ینشرلکم الخ[4]۔

پنجم: جب ناجنسوں کی صحبت میں ہو تو ایسے وقت خلوت مکمل دین ہے۔

خلوت کی حقیقت

میں نے دعویٰ کیا تھا الحمدللہ آیت سے وہ ثابت ہو گیا کہ خلوت فی نفسہ مقصود نہیں بلکہ جن لوگوں نے اس کو مقصود سمجھا ہے ان پر حق تعالیٰ نے انکار فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے ورھبانیۃ ابتدعوھا ما کتبناھا علیھم الا ابتغاء رضوان اللہ فما رعوھا حق رعایتھا[5]۔

یہ آیت بنی اسرآئیل کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ترک تعلقات کو انہوں نے خود ہی ایجاد کر لیا تھا ہم نے ان پر اس کو فرض نہیں کیا۔ اس آیت کی ترکیب یہ

---

(۱) تنہائی کا فائدہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ اجتماع نقصان دیتا ہو (۲) جب باطنی طور جدائی ہے تو ظاہری بھی جدائی ہونی چاہیے (۳) تنہائی اپنی ذات کے اعتبار سے مقصود نہیں (۴) جیسا کہ اس پر لفظ "ینشرلکم" دلالت کرتا ہے (۵) سورۃ الحدید آیت ۲۷ ترجمہ: اور انہوں نے رہبانیت کو خود ایجاد کر لیا ہم نے ان پر اس کو واجب نہ کیا تھا لیکن انہوں نے حق تعالیٰ کی رضا کے واسطے اس کو اختیار کیا تھا سو انہوں نے اس کی پوری رعایت نہ کی۔ بیان القرآن ج ۱۱ ص ۱۱۰

ہے کہ "الا" بمعنی "لکنی" ہے اور "ابتغاء" کا عامل مقدر ہے اور تقدیر کلام یہ ہے کہ لکن فعلوها ابتغاء رضوان الله الخ یعنی انہوں نے اس رہبانیت کو اللہ کی رضامندی طلب کرنے کے لیے اختیار کرلیا تھا لیکن چونکہ اس کی رعایت نہ کی اس لیے رضاء حق سے محروم رہے۔ پس حق تعالیٰ نے ایسے ترک تعلقات کو ابتداع سے تعبیر فرمایا اس لیے کہ ترک تعلقات سے مقصود تقلیل تعلقات ہے نہ کہ یکلخت[1] تعلقات ترک کردیے جائیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا تھا مخلوق سے علیحدہ ہو کر جنگل میں رہتے تھے نہ کسی سے ہنستے تھے نہ بولتے نہ نکاح کرتے تھے، اس پر رد فرمایا ہے، ایسا ترک تعلقات پسندیدہ نہیں بلکہ ہنسو، بولو، کھاؤ، پیو، ہاں انہماک مضر[2] ہے اور حضور ﷺ سے زیادہ کون ہوگا۔ آپ ہنستے بھی تھے، باتیں بھی کرتے تھے بیبیوں کے پاس بھی جاتے تھے۔ اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ حضور ﷺ کو تو ضرورت خلوت اور ترک تعلقات کی نہ تھی اور ہم کو ضرورت ہے فکیف القیاس[3] بات یہ ہے کہ یہ صحیح ہے لیکن قواعد شرعیہ سے ثابت ہے کہ ہم کو بھی ایک حد خاص ہی تک ضرورت ہے یعنی جب تک کہ نسبت راسخ نہ[4] ہو اس وقت تک خلوت کی ضرورت ہے اور جب رسوخ ہو جائے اس وقت یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ مطلقاً ضرورت نہیں ہے ضرورت تو اس وقت بھی ہے لیکن فرق اس قدر ہے کہ ابتداء میں تو زیادہ خلوت کی ضرورت ہے اور رسوخ کے بعد بھی ضرورت رہتی ہے لیکن قلیل خلوت کی، اور دلیل اس کی یہ ہے کہ حضور ﷺ کو ارشاد ہے و تبتل الیه تبتیلا[5]۔ اور ارشاد ہے فاذا فرغت فانصب[6]۔ پس اہل تمکین کے لیے بھی اس کی ضرورت رہتی ہے کہ شب و

---

(۱) ایک دم (۲) نقصان دہ (۳) پس آپ پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے (۴) پختہ نہ ہو جائے (۵) سورۃ المزمل آیت ۸ اور سب سے قطع کر کے اسی کی طرف متوجہ رہو (۶) الانشراح آیت ۷۔ تو آپ جب فارغ ہو جایا کریں تو محنت کیا کیجیے

روز میں کوئی وقت ایسا ہو کہ جس میں ان کی یہ حالت ہو۔

خوشا وقتے و خرم روزگارے — کہ یارے برخورد از وصل یارے

(وہ وقت کتنا اچھا اور وہ زمانہ کتنا مبارک ہے جبکہ ایک دوست اپنے دوست کے وصل سے مستفید ہوتا ہے اور یہ کیفیت ہو۔

بفراغ دل زمانے نظرے بماہروے — بہ ازانکہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے ہوئے

(سکون قلب کے ساتھ ایک نظر کسی معشوق کی طرف کرنا بہتر ہے اس شاہی سائبان سے جہاں دن بھر شور و غوغا برپا ہے)

پس خلوت قلیلہ کی ہر وقت ضرورت ہے باقی خلوت مدیدہ اور ترک تعلقات کی ایک حد خاص تک ضرورت رہتی ہے لیکن اس خلوت کے اندر بھی اس کی ضرورت ہے کہ حقوق واجبہ فوت نہ ہوں اور اتباع سنت کے ساتھ ہوں، بعضوں کی شہرت ہوجاتی ہے، کہ فلاں صاحب کسی سے بولتے نہیں بلکہ روٹی نہیں کھاتے، یا فلاں بزرگ آم نہیں کھاتے، ان لوگوں نے حلال چیزیں چھوڑ کر ایک شے یعنی عجب[1] اور ریا[2] کو اختیار کیا، اور نیز گویا در پردہ اللہ میاں پر بھی معترض ہیں کہ یا اللہ میاں آپ نے یہ چیزیں فضول پیدا کی ہیں ان کی ضرورت نہ تھی یہ سب فضول اور مردود باتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں کھانے کے لیے پیدا کی خوب کھاؤ پیو۔

ترک لذات کی حقیقت

ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ فصل کی ہر شے کھانا چاہیئے حتیٰ کہ بھٹے بھی کھاؤ لیکن حدود کی رعایت ہر شے کے اندر رکھنا ضروری ہے۔ اتنا نہ کھاؤ کہ منہ سے

---

(۱) تکبر (۲) دکھاوا

ہگنے لگے۔ جیسا ایک شخص تھے بہت کھانا کھا لیا تھا۔ مولوی فیض الحسن صاحب کے پاس آئے کہ حضرت کوئی تدبیر بتلائیے تکلیف ہو رہی ہے، حضرت مولوی صاحب نے ایک پڑیہ دی کہ اس کو کھالو۔ کہنے لگا کہ واہ حضرت اگر اس کی جگہ ہوتی تو ہیں دو لقمے اور ہی نہ کھاتا، میں نے تو بڑی محنت سے بھرا ہے ہاں کوئی لیپ اوپر کا بتلادیجیے تو اتنا کھانا بھی اچھا نہیں ہے۔ باقی سب چیزیں کھاؤ۔ آج کل جنس لوگ تو بزرگی کی وجہ سے نعمتوں کے کھانے سے محروم رہتے ہیں اور بعضے وہم میں پڑے ہوئے ہیں کہ فلاں شے نہ کھاؤ ثقیل ہے پیٹ میں سدہ[1] پڑ جاوے گا۔ فلاں شے نہ کھاؤ بخار آجائے گا۔ یاد رکھو یہ مقولہ مشہور ہے کہ ان تمارضتم تمرضوا ۔ یعنی اگر تم بیمار نہ ہوگے تو بیمار ہوجاؤ گے۔ بے کھٹکے سب چیزیں کھاؤ۔ ہاں اگر کوئی اس وقت بیمار ہو اور حکیم جی نے پرہیز بتلایا ہو تو وہ دوسری بات۔ باقی اچھے خاصے تندرست کو آئندہ کے اوہام سے نہ ڈرنا چاہیے۔ دیکھو، گاؤں کے لوگ ہیں وہ خوب بے کھٹکے سب کچھ کھا جاتے ہیں ان کو کچھ بھی نہیں ہوتا ہے۔ ایک حکیم صاحب تھے وہ کہیں جنگل میں چلے جا رہے تھے ایک کسان کو دیکھا کہ گھر سے اس کے کھانا آیا چار روٹ موٹے موٹے اور ایک لوٹہ چھاچھ[2] کا۔ اس نے وہ چاروں روٹیاں کھا کر اوپر سے چھاچھ کا لوٹ منہ سے لگالیا اور حکیم صاحب قواعد کی رو سے ڈر رہے ہیں کہ اب یہ ضرور مرے گا۔ جب وہ سب پی گیا حکیم جی نے کہا چودھری صاحب اس چھاچھ کو اگر آپ درمیان میں پیتے تو اچھا تھا۔ بولا کہ اچھا اپنے لڑکے کو پکارا ارے جا چار روٹے[3] اور لے آ: اس کا کہنا بھی کرلوں۔ چار روٹ اور منگا کر کھالیے اور کہنے لگا اب تو بیچ میں ہوگئی تو ایسے لوگوں کو کچھ ضرر نہیں ہوتا اس لیے کہ بلا وہم و تکلف کھاتے ہیں، اور پھر محنت خوب کرتے ہیں۔

---

(۱) سخت قبض ہوجائیگا (۲) لسی (۳) موٹی موٹی روٹیاں

پس خوب محنت کرو۔ ذکر کی ضربیں لگاؤ اور خوب کھاؤ۔ آج کل یہ حالت ہے کہ کسی کو یہ خبط ہو گیا ہے کہ میں اگر کھاؤں گا تو میری بزرگی چھن جائے گی; کسی کو یہ خبط ہے اور ایسے لوگ زیادہ ہیں کہ اگر فلاں شئے کھاؤں گا تو تندرستی جاتی رہے گی ترک لذات کا میں انکار نہیں کرتا کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ بزرگوں نے کیا ہے اور کرایا بھی ہے، مگر اس کی ایک حد ہے۔ ایک بڑھیا نے اپنے بیٹے کو حضرت غوث پاکؒ کے سپرد کردیا کہ حضرت اس کی بھی تعلیم فرمائیے حضرت نے اس کو خانقاہ میں بھیجدیا وہاں اس کو سوکھے ٹکڑے کھانے پڑے ایک مدت کے بعد وہ بڑھیا آئی دیکھا کہ بیٹیا بہت دبلا ہو رہا ہے۔ بڑا غصہ آیا اور پہنچی حضرت کی خدمت میں۔ دیکھا کہ حضرت مرغ نوش جاں[1] فرما رہے ہیں اور بھی زیادہ بے تاب ہوئی اور کہا کہ حضرت آپ تو مرغ کھاتے ہیں اور میرا بیٹا سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ فرمایا کہ دیکھ اس طرف ان ہڈیوں کو، فرمایا قم باذن اللہ وہ ہڈیاں آپس میں ایک دوسرے سے مل کر اچھا خاصا مرغ بن کر کھڑا ہو گیا۔ فرمایا کہ جب تیرا بیٹا ایسا ہوجائے گا وہ بھی مرغ کھائے گا ابھی اس کو اسی کی ضرورت ہے مولانا فرماتے ہیں۔

لقمہ و نکتہ است کامل را حلال   تو نہ کامل مخور می باش لال

(جو آدمی کامل ہوتا ہے اس کے لیے یہ جائز ہے کہ حلال روزی کھائے اور راز بیان کرے کیونکہ تو جاہل ہے اس لیے تو خاموش رہ)

یعنی تصوف کے نکتہ بیان کرنا اور ترنقے کھانا کامل کو حلال ہے یعنی اس کا مضر نہیں اور جو کامل نہیں ہے اس کو کمال کی حد تک خموش اور تارک لذات رہنا چاہیئے۔

---

(۱) مرغ تناول فرما رہے ہیں

آج کل ترک لذات کی اجازت نہیں

لیکن وہ زمانہ دوسرا تھا اس وقت کا مطلب بھی جدا تھا، زمانہ کے اختلاف سے مطلب ہمیشہ بدل جایا کرتا ہے، اس وقت کے لوگ شائق تھے اور حق تعالیٰ سے ان کا علاقہ[1] قوی تھا اپنے مجاہدات و ریاضیات سے ان کے تعلق میں کوئی فرق نہ آتا تھا اب لوگوں کی دوسری حالت ہے اب وہ وقت کہ لوگوں کی ہمتیں ضعیف[2] اور شوق کم اور قویٰ کمزور ہوگئے ہیں اور خدا تعالیٰ کی محبت بھی بہت کم ہے اگر خدا تعالیٰ کھانے پینے کو دے تو کچھ لیتے ہیں ورنہ اللہ میاں سے بھی کدورت[3] ہوجاتی ہے۔ اب خوب گھی کھاؤ اور دودھ پیو، قوت آوے گی، تو خدا تعالیٰ کی محبت کا بھی کچھ سرسراہٹ[4] ہوگا۔ اور نیز آج کل عقل بھی کم ہے کھانا پینا ترک کرکے سمجھتے ہیں کہ ہم نے بڑا کام کیا ہے پھر اس پر منتظر ہوں گے ثمرات کے، اور اپنے کو حقدار سمجھیں گے، پھر اس کے بعد دو صورتیں ہوں گی کہ وہ ثمرات مزعومہ[5] اگر حاصل نہ ہوئے تو سمجھیں گے کہ جب اتنی محنت سے کچھ نہ ہوا تو بس جی اب کچھ حاصل نہ ہوگا جو کرتے تھے اس کو بھی چھوڑ بیٹھیں گے۔ اور اگر حاصل ہوگئے تو اپنی محنت کا ثمر[6] سمجھیں گے، اور عجب[7] میں مبتلا ہوں گے اس لیے اب یہ مجاہدہ ترک ہوگیا ہے۔

مسلمانوں کے مجاہدہ خلوت کے لیے اعتکاف مقرر فرمایا

اب مجاہدہ صرف خلوت کا ہے لیکن خلوت کا بھی ہر شخص کو وقت طویل نہیں ملتا اس لیے حق تعالیٰ نے شریعت مقدسہ میں ایک خاص خلوت مقدر فرمائی

---

(۱) تعلق (۲) کمزور (۳) دل مبتلا ہوجاتا ہے (۴) اللہ کی محبت بھی رگ و ریشہ میں دوڑ جائے (۵) اپنے خیال کے مطابق نتائج مرتب نہ ہوئے (۶) اپنی محنت کا نتیجہ سمجھیں گے (۷) تکبر

ہے اور ایک بڑے زمانہ میں چھوٹا سا زمانہ اس خلوت کے لیے مشروع فرمایا ہے، یعنی رمضان المبارک کے عشرہ اخیرہ کو اس لیے منتخب فرمایا ہے اور اس خلوت کا نام اعتکاف رکھا ہے خلوت نام نہیں رکھا اس لیے کہ فلاسفہ اور حکماء کا نام ہے اس لیے اس کو چھوڑ دیا گیا اس لیے اس کو خلوت سے تعبیر نہ کرنا چاہیے اسی واسطے حدیث شریف میں آیا ہے کہ عشاء کو عتمہ نہ کہو، اس لیے کہ یہ جاہلیت میں اس وقت کا نام عتمہ ہے۔ آج کل یہ عام غلطی ہو رہی ہے اور منشاء اس غلطی کا مورخین یورپ کی تقلید ہے، وہ یہ کہ جناب رسول اللہ ﷺ کو بانی اسلام کہتے ہیں وہ لوگ آپ کو بانی اسلام اس بنا پر کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک اسلام نعوذ باللہ حضور ﷺ کا بنایا ہوا اور گھڑا ہوا ہے آسمانی مذہب نہیں ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی ہمارے بھائی بھی کہنے لگے اگر اس میں تاویل نہ کی جاوے تو بہت سخت لفظ ہے، اور سخت بے ادبی ہے۔ حضور ﷺ کے القاب جو حدیث و قرآن میں آئے ہیں ان سے تعبیر کرنا چاہیے۔ قرآن میں یاایہا الرسول یا ایہا النبی[1] فرمایا ہے اور حضور ﷺ فرماتے ہیں انا حبیب اللہ[2] ان القاب سے زیادہ باوقعت کون سے القاب ہوں گے جو آپ ان کو چھوڑ کر غیر قوموں کے مخترعہ القاب[3] کو اختیار کرتے ہیں۔ ایسے ہی لفظ خلوت کا قدیم لفظ ہے اللہ تعالیٰ نے ہم کو بجائے اس کے اعتکاف سکھلایا ہے، ارشاد ہے **فلاتباشروھن وانتم عاکفون فی المساجد**[4] اور فرماتے ہیں **وطہر بیتی للطائفین والقائمین**[5] گو لفظ خلوت کا استعمال بھی جائز ہے۔ بزرگوں کے کلام میں بھی ہے مگر جس خلوت کا لقب

---

(۱) اے رسول اے نبی (۲) میں اللہ کا محبوب ہوں (۳) غیر قوموں کے گھڑے ہوئے القاب (۴) سورہ البقرہ: آیت ۱۸۷۔ اور ان بیبیوں سے اپنے بدن بھی مت ملنے دو جس زمانے میں تم لوگ اعتکاف والے ہو مسجدوں میں (۵) سورۃ الحج آیت ۲۶۔ اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں کے واسطے پاک رکھنا

اعتکاف فرمایا ہے۔ وہاں یہ لفظ اختیار کرنا چاہیے، یہ کلام تو عنوان میں تھا۔

اشراقین اور مسلمانوں کی خلوت میں فرق

اور ان کی اور ہماری خلوت میں بدرجہ معنون بھی فرق ہے، ہماری خلوت بوجہ رعایت حدود محمود ہے، اوران کی خلوت کی اللہ تعالیٰ نے مذمت فرمائی ہے، چنانچہ ارشاد ہے فمارعوها حق رعايتها[1] وجہ یہ ہے کہ جب حدود کی رعایت نہ ہو تو کیسی ہی اچھی چیز ہو وہ بھی مذموم[2] ہوجاتی ہے اور ان کی خلوت میں چند نوع کی کمی تھی۔ اول تو بوجہ طویل ہونے کے ہر شخص اس سے منتفع نہیں ہوسکتا تھا اس لیے مدت العمر[3] تمام تعلقات چھوڑ کر کیسے کوئی شخص محبوس[4] رہ سکتا ہے۔ حق تعالیٰ نے ایسا مختصر زمانہ اس کے لیے مقرر فرمایا ہے، کہ ہر شخص کو آسان ہے اور پھر اس سے زیادہ نافع کما سَنُبَیِّنُ مفصلا[5]۔ دوسرے وہ خلوت ایسی جگہ کرتے تھے جہاں پرندہ پر نہ مارسکے یعنی وہ پہاڑوں کے غاروں اور جنگل کے گوشوں میں جاکر بیٹھتے تھے کہ خواہ مخواہ وحشت ہوکر آدمی آدمیت سے نکل کر وحوش[6] میں شامل ہوجاوے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی عجیب وغریب اصلاح فرمائی، وہ یہ کہ اعتکاف کو مساجد میں مشروع فرمایا، کہ جن سے خلوت مقصود تھی اس سے یکسوئی ہوگئی، یعنی ناجنسوں سے اور جن سے یکسوئی مقصود نہ تھی یعنی اپنے ہم جنس، ان سے خلوت نہیں ہوئی۔

---

(۱) سورۃ الحج آیت ۲۷۔ سو انہوں نے اس کی پوری رعایت نہ کی (۲) بری (۳) ساری عمر (۴) قید
(۵) جیسا ہم عنقریب بیان کریں گے (۶) جانوروں

جلیس صالح خلوت سے بہتر ہے

مجھے قصہ یاد آیا کہ ایک مرتبہ ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ تنہا بیٹھے تھے میں وہاں جا پہنچا جب میں نے دیکھا کہ حضرت تنہا تھے میں نے عرض کیا، کہ حضرت میں مخل وقت ہوا، فرمانے لگے کہ نہیں خلوت از اغیار نہ از یار[1] تم تو اپنے ہمجنس ہو اور اسی مضمون کی موید[2] حدیث یاد آئی۔ ارشاد ہے الوحدة خیر من الجلیس السوء الجلیس الصالح خیر من الوحدة یعنی تنہائی برے ہمنشین سے بہتر ہے اور اچھا ہمنشین تنہائی سے بہتر ہے۔ سبحان اللہ شریعت نے کیا اعتدال سکھایا ہے، اور راز اس میں یہ ہے کہ خلوت کا مقصود تو یہ ہے کہ مشغولی[3] بحق بڑھے لیکن جب اچھا جلیس کوئی ملے تو اس سے مشغولی مع اللہ نسبت خلوت کے زیادہ ہوتی ہے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ یار موافق سے جس قدر حضور اور مشغولی بڑھتی ہے اس قدر خلوت سے نہیں بڑھتی؛ چنانچہ مجھ کو اس وقت جس قدر لطف بوجہ جلوت کے اس بیان میں آرہا ہے اس قدر خلوت میں نہیں آتا، جب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی وفات ہوئی تو حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ قدس سرہ ایسے الفاظ حسرت سے فرمایا کرتے تھے کہ اکیلے ہی رہ گئے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

ہر کہ او را ہمزبانے شد جدا ‌‌ ‌ بے نوا شد گرچہ دارد صد نوا

(جو محبوب کا ہمزبان ہوجاتا ہے وہ دنیا سے جدا ہوجاتا ہے۔ وہ اس سازو سامان کے باوجود بے نوا ہوجاتا ہے)

چونکہ گل رفت و گلستاں در گذشت ‌ ‌ ‌ نشنوی زیں پس ز بلبل سر گذشت

---

(۱) خلوت غیروں سے پسندیدہ ہے نہ کہ دوستوں سے (۲) تائید میں حدیث پیش کی (۳) انسان اللہ کے ساتھ مشغول ہو

(جب گلستاں سے گل چلا جاتا ہے تو وہاں بلبل کی سرگذشت بھی سننے میں نہیں آتی)

حقیقت میں یہ لوگ سمجھدار تھے۔ پس اگر جلیس صالح میسر[1] ہو تو خلوت پر اس کو ترجیح ہے۔ آج کل تو اکثر صحبت بری ہی ہے، اس لیے خلوت ہی بہتر ہے)

درین زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است　　صراحی مئی ناب و سفینہ غزل است

(اس زمانے میں اگر کوئی دوست بغیر مکر و فریب کے ہے، تو وہ صرف شراب کی صراحی اور غزل کا سفینہ ہے)

اور کوئی جلیس موافق میسر[2] ہو تو اس کی نسبت ہی بہتر ہے۔

مقام امن ولی بے عشق و رفیق شفیق

گر مدام میسر شود زہے توفیق

(اگر مقام امن بغیر شور و غل کے اور مہربان دوست ہمیشہ کے لیے میسر ہو جائیں تو ایسی توفیق کا کیا کہنا)

لیکن اس زمانہ میں جلیس[3] صالح کہاں ہے اگر ہو تو سبحان اللہ اس سے مستفیض ہو، ورنہ خلوت سب سے بہتر ہے۔ اور اگر صحبت ہی کو دل چاہے تو مردوں کی صحبت میں بیٹھے ان کے پاس بیٹھ کر آخرت تو یاد آوے گی، وہ مردے ان زندوں سے بہتر ہیں، یہ زندے تم کو ہلاک کرتے ہیں وہ مردے تم کو حیات بخش ہیں۔

---

(۱) اچھا ہمنشین مل جائے (۲) ہم خیال ساتھی مل جائے (۳) اچھے ہمنشین

خلوت فی نفسہ مقصود نہیں

غرض فی المساجد سے اس طرف اشارہ فرمادیا ہے کہ خلوت[1] بے نمازیوں سے مقصود ہے، اور نمازیوں سے خلوت مقصود نہیں، ان سے تو جلوت مقصود ہے اسی واسطے حکم ہے کہ ایسی مسجد میں اعتکاف کرو جہاں جماعت ہوتی ہو، ایسی مسجد میں نہ ہو جہاں آدمی کا نام و نشان نہ ہو، الو بولتے ہوں اس سے بھی صاف معلوم ہوگیا کہ جماعت مقصود ہے چنانچہ فقہاء بے تکلف سمجھ گئے کہ اعتکاف سے انتظار جماعت کا ثواب اور ادراک جماعت مقصود ہے۔ کہاں گئے وہ غالی جو خلوت ہی کو مقصود ٹھیراتے ہیں اور خلوت کی تحصیل کے واسطے بہت سے حقوق واجبہ ضائع کرتے ہیں، دیکھیے فقہاء کے اس لکھنے سے معلوم ہوگیا کہ خلوت بانتظار جلوت[2] مقصود ہے پس خلوت ایک انڈا ہے اور جلوت ایک بچہ ہے جب انڈے سے ایک بچہ نکل آوے تو انڈا بیکار ہے، بہر حال فی المساجد کی قید نے صاف بتلادیا کہ خلوت فی نفسہ مقصود نہیں۔ سبحان اللہ کیا اعتدال ہے نہ ایسی خلوت ہے کہ توحش تک نوبت آجائے اور نہ ایسی ہے کہ مقصود حاصل نہ ہو، بالکل مذاق اور طبائع کے موافق شریعت کی، اسی حسن و جمال ہی پر نظر کرکے تو میں کہا کرتا ہوں۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

(ترے سراپا میں سر سے پیر تک جہاں بھی نظر ڈالتا ہوں ہر جگہ رعنائیاں دامن دل کھینچ لیتی ہیں)

ہر ہر ناز دل ربا اور ہر ہر ادا نرالی اور سادہ اور پھر دقیق۔ ع

دلفریبان نباتی ہمہ زیور بستند۔

---

(۱) تنہائی بے نمازیوں سے مقصود ہے نمازیوں سے نہیں (۲) خلوت جلوت کے انتظار میں مقصود ہے

یہ حالت تو حکماء کے مجاہدوں اور ریاضت کی ہے اور شریعت کی کیا حالت ہے۔ ع

اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد

(اے سرو تجھے مبارک باد ہے کہ تو ہر قید سے آزاد ہے)

اور جو لوگ اس آزادی کو قید اور ایسے آزادی کو مقید سمجھتے ہیں تو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ یہ قید وہ ہے۔

اسیرش نخواہد رہائی ز بند　　　شکارش نجوید خلاصی ز بند

(جو اس کا اسیر[1] ہے وہ قید سے رہائی نہیں چاہتا اور جو اس کا شکار ہے وہ قید سے چھٹکارا نہیں چاہتا)

اگر تم کسی پر عاشق ہوجاؤ اور وہ مدت کے بعد تم کو ملے اور لپٹ جائے اور خوب تم کو دبادے اور پھر کہے کہ چھوڑوں تو ہر گز تم اس پر راضی نہ ہوگے بلکہ غنیمت سمجھوگے کہ مدت کے بعد تو یہ ملا ہے چاہے جس قدر اس سے قرب ہو، تو جناب آپ جس آزادی کو آزادی کہتے ہیں لعنت ہے ایسی آزادی پر جو خدا ورسول ﷺ سے آزادی ہو، ہمارے نزدیک جو اس قسم کا آزاد ہے ہم تو اس سے بے تکلف کہیں گے۔

مبادا دل آں فرومایہ شاد　　　کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد

(خدا کرے اس کمینے کا دل کبھی خوش نہ ہو کہ جو دنیا کے واسطے دین کو برباد کردیتا ہے)

اور کیا آزادی ہے اپنے نزدیک آزاد ہوں گے سیکڑوں بلاؤں میں مقید ہیں، کوئی بوٹ کا مقید ہے، کوئی سوٹ، کوئی کانٹے کا، کوئی چھری کا، آزاد ہم ہیں۔

---

(۱) قیدی

ان کی عزت اگر جوتہ اور بوٹ سوٹ سے ہے ہماری عزت دولت ایمان سے ہے، وہ اگر عبدالفیشن[1] ہیں تو ہم عبداللہ[2] ہیں۔ بہر حال خلوت کو ان حکمتوں کی وجہ سے مشروع فرمایا۔

معتکفین کے لیے مسجد میں پردے باندھنے کی حکمت

لیکن اس پر بھی مخاطبین میں بعض ایسے تھے کہ یہ سن کر دس روز تک مسجد میں رہیں گے، نفس کو مزہ آیا کہ آبا خوب باتیں گھڑیں گے۔ حضور ﷺ نے اس کا اس طرح انسداد فرمایا، کہ مسجد میں ایک چٹائی کا حجرہ بنایا اور اس میں رہے، اس سے یہ بتلایا کہ مسجد میں رہو تو اس طرح رہو۔ صوفیہ نے یہاں سے ایک ایسا حجرہ خلوت کے لیے اختیار کیا ہے کہ اس میں سوائے چٹائی کے کچھ نہ ہوتا تھا۔ ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ کے دو حجرے تھے ایک تو حاجت کی اشیاء[3] رکھی تھیں، اور ایک مخصوص تھا اس میں سوائے چٹائی کے اور کچھ نہ تھا، اور یہ بھی صوفیہ نے فرمایا ہے کہ خلوت کا حجرہ چھوٹا ہونا چاہیے۔ الحاصل حضور ﷺ نے مسجد میں چٹائی کا حجرہ بنا کر تعلیم فرمایا کہ مسجد میں اس طرح رہنا چاہیے اور یہی ماخذ ہے اس عادت کا کہ پردہ وغیرہ اعتکاف میں باندھتے ہیں، لیکن اس میں بھی شاید کوئی غلو کرتا، اس لیے کہ یہ ایک امتیاز کی شان ہے کہ حجرہ میں خود بیٹھے ہیں اور باہر مریدین و معتقدین جمع ہیں کہ شاہ صاحب نکلیں گے تو زیارت کریں گے اور باتیں کریں گے اس لیے حضور ﷺ نے اس کا یہ انتظام فرمایا کہ نماز کے وقت کہ وہی وقت اجتماع کا ہے خود بنود باہر رونق افروز ہو گئے اسی پر اہل اعتکاف کا طریقہ ہے کہ نماز کے وقت پردہ وغیرہ سب اٹھا دیتے ہیں تاکہ کوئی امتیاز کی شان پیدا ہو کر عجب[4] نہ ہو۔

---

(۱) فیشن کے بندے ہیں (۲) اللہ کے بندے ہیں (۳) ضرورت کی چیزیں (۴) تکبر

واللہ اگر تمام جہان کے عقلاء چاہتے کہ ان مصالح کی رعایت کریں تو ہرگز نہ کرسکتے۔ یہ نور وحی ہے کہ جو ایسے دقیق مصالح کی رعایت فرمائی[1] - کہ من وجہ قید من وجہ اطلاق[2] خلوت بھی محفوظ اجتماع بھی محفوظ۔

طاق راتوں میں لیلۃ القدر ہونیکی حکمت

علاوہ اس کے ایک اور دقیق رعایت کی وہ یہ ہے کہ اس پر نظر فرمائی کہ رات کو کام زیادہ کرنا چاہیئے۔ لیکن رات آرام کا وقت ہے اگر دس کی دس راتیں کام کریں تو بیمار ہوجانے کا اندیشہ تھا: اس لیے ان راتوں کی حق تعالیٰ نے عجیب طریقہ سے تقسیم فرمائی کہ طاق راتوں کو شب قدر بنا کر بتلادیا، کہ ایک رات سوؤ اور ایک رات جاگو اوران راتوں میں ایسی برکات رکھ دیں کہ الف شہر[3] کی خلوت سے وہ بات نصیب نہیں جوان راتوں سے ہوتی ہے۔ گر حکماء اپنی عقل سے ہزار تدبیریں کرتے اور تدبیریں کرتے کرتے مر رہتے تو یہاں تک ہرگز رسائی نہ ہوتی، اس لیے کہ اس کا ادراک کیسے ہوتا[4] کون سے زمانہ میں کتنی برکت رکھی ہوئی ہے اور اسی طرح کسی زمانہ کے اندر کوئی برکت پیدا کرنے کی بھی قدرت نہ تھی یہ تو خالق الزمان[5] کے تصرف سے برکت پیدا ہوگئی: اور انہی کے بتلانے سے معلوم ہوا۔ صاحبو! یہ برکات تم کو مفت ملتی ہیں۔

اعتکاف کی کم از کم مدت

گواب دس دن باقی نہیں رہے۔ لیکن جو باقی ہیں ان کو بھی ہاتھ سے نہ دو،

---

(۱) چھوٹی چھوٹی مصلحتوں کی رعایت کی (۲) ایک اعتبار سے قید ایک اعتبار سے آزادی (۳) ایک ہزار ماہ کی خلوت (۴) یہ بات کیسے معلوم ہوتی (۵) تمام زمانوں کو پیدا کرنے والے اللہ تعالیٰ کے حکم سے برکت پیدا ہوگئی

کم از کم تین ہی دن دنیا کے بکھیڑے چھوڑ کر مسجد میں بیٹھ جاؤ۔ تین دن نہ سہی ایک ہی دن سہی۔ میں نے ایک جگہ دیکھا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ میرے کان ہی میں کلمہ کہہ لو۔

بس ہے اپنا ایک بھی نالہ اگر پہنچے وہاں گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم

اور اس سے زیادہ سنیے: علماء نے لکھا ہے کہ ایک گھنٹہ کا اعتکاف بھی مشروع ہے اللہ اللہ اگر اب بھی کوئی محروم رہے تو بہت ہی خسران کی بات ہے۔

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

ان کی طرف سے تو کچھ کمی نہیں ہے لیکن آپ بھی تو کچھ حرکت کیجیے۔ ہماری اور حق تعالیٰ کی ایسی مثال ہے جیسے بچہ اور آپ کو بچہ چل نہیں سکتا۔ لیکن تم منتظر اس کے ہو کہ یہ کچھ حرکت کرے۔ جب یہ کچھ حرکت کرے تو میں اس کو گود میں اٹھالوں گا سنبھال لوں گا اسی طرح حق تعالیٰ دیکھتے ہیں کہ بندہ کچھ تو کرے جب یہ کچھ حرکت کرتا ہے تو ادھر سے رحمت ہوتی ہے جذب ہوتا ہے۔ ورنہ اگر ادھر سے جذب نہ ہوتا تو یہ مسافت آپ کے قطع کرنے سے قطع نہ ہوتی۔

نگردد قطع ہرگز جادہ عشق از دویدن ہا
کہ می بالد بہ خود ایں راہ چوں تاک از بریدن ہا

(عشق کا راستہ دوڑنے سے ختم نہیں ہوتا بلکہ یہ راستہ اور بڑھتا ہے جس طرح سے انگور کی بیل کاٹنے سے بڑھتی ہے)

چونکہ رمضان المبارک کا اخیر ہے اس لیے اس کو غنیمت سمجھو: خدا جانے پھر نصیب ہو یا نہیں: اور جمعہ گذشتہ کو حقوق بیان کیے گئے تھے اس کو بھی تازہ کرلو: خلاصہ یہ ہے کہ اعتکاف، روزہ: تراویح ان ایام کے عبادات ہیں ان کے حقوق ادا کرو اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ توفیق عطا فرماویں۔ آمین

تمت

تعداد طلباء (درجہ وار)	کامران بلاک	پرانی انار کلی	اردو نگر	راوی بلاک	مصطفیٰ ٹاؤن
☆ متوسط (نصاب نزل)	۱۴۸	۱۰	—	—	—
☆ ثانویہ عامہ	۷۰	۵	—	—	—
☆ ثانویہ خاصہ	۲۹	—	—	—	—
☆ شہادۃ العالیہ	۲۰	—	—	—	—
☆ شہادۃ العالمیہ	۱۵	—	—	—	—
☆ قراءات سبعہ	۱۷	۸	—	—	—
☆ قراءات عشرہ	۸	۵	—	—	—
☆ تجوید للعلماء	—	۷	—	—	—
☆ تخصص فی الفقہ	۵	—	—	—	—
☆ حفظ (قرآن مجید)	۱۱۱	۵۲	۳۰	۲۱	۶۰
☆ ناظرہ (قرآن مجید)	۱۲۳	۳۰	۱۶	۳	—
☆ میزان طلباء (۷۸۴)	۵۴۷	۱۰۷	۴۶	۲۴	۶۰

عملہ جامعہ دار العلوم الاسلامیہ

☆ اساتذہ حفظ و ناظرہ	۱۲
☆ اساتذہ تجوید و قراءات	۵
☆ اساتذہ درس نظامی	۱۱
☆ اساتذہ نصاب نزل	۲
☆ شعبہ تحقیق و کتب خانہ	۳
☆ عملہ مساجد	۷
☆ عملہ مطبخ و چوکیدار	۱۴
☆ عملہ صفائی	۴
☆ شعبہ اہتمام و انتظام	۱۲
☆ میزان عملہ	۷۰

مجوزہ میزانیہ برائے تعلیمی سال ۲۱-۱۴۲۰ھ مطابق ۲۰۰۰ء

تنخواہ مدرسین (کامران بلاک۔ مصطفےٰ ٹاؤن۔ پرانی انار کلی۔ اردو محمد۔ ریلوی بلاک)	1857120/=
تنخواہ عملہ انتظامی (کامران بلاک۔ پرانی انار کلی) (ایک فرد کی مزید ضرورت ہے)	561106/=
تنخواہ عملہ مساجد (کامران بلاک۔ مصطفےٰ ٹاؤن)	149207/=
تنخواہ عملہ ادارہ اشرف التحقیق (دو افراد کی مزید ضرورت ہے)	162585 /=
اخراجات گیس۔ بجلی۔ پانی اور فون (کامران بلاک۔ مصطفےٰ ٹاؤن پرانی انار کلی)	841443/=
مصارف مطبخ طلباء مع وظائف طلباء (کامران بلاک، مصطفےٰ ٹاؤن، پرانی انار کلی) پوشاک، کتب و سٹیشنری،	2130189/=
اور علاج معالجہ طلباء کامران بلاک، مصطفےٰ ٹاؤن، پرانی انار کلی	100.000/=
اسٹیشنری و ڈاک جامعہ ماہانہ پمفلٹوں کی ترسیل اس میں شامل ہے	37922/=
تبلیغ، نشرواشاعت (ماہانہ رسائل کی اشاعت بھی شامل ہے)	200692/=
مرمت اشیاء و عمارات جامعہ (کامران بلاک، مصطفےٰ ٹاؤن، پرانی انار کلی)	250000/=
تواضع مہمانان جامعہ (کامران بلاک۔ مصطفےٰ ٹاؤن۔ پرانی انار کلی)	10000/=
اخراجات امتحانی سنٹر جامعہ وفاق المدارس	32600 /=
مفروشات جامعہ (کامران بلاک۔ مصطفےٰ ٹاؤن۔ پرانی انار کلی)	
مفروشات مساجد (کامران بلاک۔ مصطفےٰ ٹاؤن۔ نیز کرایہ شامیانہ)	85587/=
اخراجات باغبانی۔ حصول چرم قربانی	94689/=
سفر خرچ اندرون و بیرون شہر بکار ادارہ	50339/=
متفرق اخراجات	20528/=
میزان	65,84,007/=

فارغین دورہ حدیث	فارغین عالیہ ۲۰۰۰ء	فارغین خاصہ ۲۰۰۰ء	فارغین عامہ ۲۰۰۰ء	فارغین متوسطہ	فارغین قرأت ۲۰۰۰ء	فارغین قرأت سبعہ	فارغین تجوید للعلماء	فارغین روایت حفص	فارغین کامل الحفظ	کامل الناظرہ	کل فارغین
5	10	18	24	42	13	25	7	35	66	38	283

بینک اکاؤنٹ نمبر: ۷-۵۵۷-۰۱۱- یو بی ایل قرطبہ روڈ انار کلی لاہور۔ ۲۱۰- دی بینک آف پنجاب مصطفےٰ ٹاؤن انار کلی لاہور